فانیؔ

کی

شاعری

ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی
ریڈر شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی۔ دہلی

حقوقِ اشاعت محفوظ ہیں

قیمت
مجلد مع گرد و پوش
بیس
روپیہ

ناشر
نسیم بک ڈپو۔ لاٹوش روڈ۔ لکھنؤ
ٹیلیفون :۔ ۴۵۳۳۴ • ۴۴۵۵۹

ناشر :۔ فہیم انہونوی (بار اوّل اکتوبر ۶۹ء) پرنٹر :۔ نظامی پریس لکھنؤ
(بار دوم ۱۹۸۳ء)

میں جو امتیاز حاصل رہا ہے اس کے اسباب اور نتائج پر بھی سرسری نظر ڈالی جائے۔ فارسی کا یہ مصرعہ اکثر ضرب المثل کے طور پر دہرایا جاتا ہے ع قیاس کن زگلستان من بہار مرا۔ یہاں بدایوں کی تاریخ اور روایات کا مفصل جائزہ تو ممکن نہیں لیکن اس شہر کا ایک مختصر تعارف جس نے فانی کو جنم دیا بے محل نہ ہوگا۔

شہر بدایوں کا شمار شمالی ہندوستان کے ان چند شہروں میں ہے جو وسعت کثرت آبادی یا دولت و ثروت کے اعتبار سے بڑے شہروں میں شامل نہ کیے جانے کے باوجود نمایاں حیثیت کے حامل ہیں یہاں اسلامی عہد سے قبل یا بعد کوئی بڑی ریاست وجود میں نہیں آئی۔ یہ علاقہ کسی بڑی تاریخی جنگ، یا انقلاب کی آماجگاہ بھی نہیں بنا۔ لیکن زندگی کے اس ٹھہراؤ، سیاسی بحرانوں اور ہنگاموں سے دوری کا ایک نتیجہ یہ بھی نکلا کہ ہندوستان کی تاریخ کے پرآشوب دور اور ہنگامہ خیز طوفان اس خطے کے نزدیک سے دبے پاؤں گزرتے رہے اور گزشتہ صدیوں میں یہاں کی زندگی کی پرسکون اور دھیمی رفتار ان سے زیادہ متاثر نہ ہو سکی۔ اسی وجہ سے بدایوں کی علمی۔ ادبی۔ مذہبی اور ثقافتی روایات کا تسلسل برقرار رہ سکا۔

ہندوستان میں اسلامی عہد کے آغاز ہی سے بدایوں کا ذکر تاریخ کے صفحات پر نمایاں نظر آتا ہے۔ اسلامی فتوحات سے قبل بھی بدایوں کی چھوٹی سی ریاست سیاسی اعتبار سے زیادہ اہم نہ تھی۔ لیکن اس شہر کے قدیم نام بیدامئو (یا بودھامئو) سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس عہد میں بھی یہ شہر مذہبی روایات اور علوم و فنون کا مرکز تھا۔ اسلامی عہد

عزت ہو تو عزم کی جستجو کر — ہمت ہو تو بے قرار ہو جا

خدا کی رحمت سے مایوسی کفر ہے

نانی کے دل سے آیۂ لاتقنطو کے بعد — زاہد وہ دل فریبیٔ حسن عمل گئی
یارب تری رحمت سے مایوس نہیں نانی — لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیے
ترے کرم سے یہ سماں ہے عالم گناہ کا — سیاہیاں امید کی تجلیاں لیے ہوئے

گریہ جوش ندامت بس اب تھمنے کا تو نام نہ لے
جب تک رحمت کا ہر پہلو، دل کا دامن تھام نہ لے

محبت کی عظمت

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا

اللہ رے اعتماد محبت کہ آج تک — ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کیے بغیر
چھین لیا تیری محبت نے مجھے — اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

ہے نخ راہ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور

آخر میں بغیر کوئی عنوان قائم کیے ہوئے کچھ اشعار پیش کر رہا ہوں فیصلہ آپ کے سپرد کرتا ہوں کہ درس اخلاقیات میں ان کو آپ کیا درجہ دیتے ہیں خوبی ان تمام اشعار کی یہ ہے کہ وہ اخلاقی درس کے باوجود شاعرانہ حسن سے محروم نہیں ہیں اور نہ کسی پروپگنڈہ کا آلۂ کار بنے ہیں۔

خود برق ہو اور طور تجلا سے گذر جا
خود شمع بن اور وادی سینا سے گذر جا

بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ
آئینہ اٹھا۔ حسن خود آرا سے گذر جا

کعبہ ہو کہ ہو دیر، وہ دنیا ہو کہ عقبیٰ
ہر منزل و ہر جادہ و ہر جا سے گذر جا

اے عزم خبر ہوش کے پردوں کو اٹھا دے
اے ذوق نظر محمل لیلا سے گذر جا

تو نے دل دے کے بس اک شان ہوس پیدا کی
ان کا بندہ بنے تو نادان وہی شان بھی لا

تجھ کو پھبتا نہیں اسلام کا دعویٰ فانی
ورنہ وہ غیرت اسلام بھی لا۔ آن بھی لا

دعا گدائے اثر ہے۔ گدا پہ تکیہ نہ کر
کہ اعتماد اثر کیا، ملا ملا، نہ ملا

میرؔ، غالبؔ اور فانیؔ

دورِ حاضر کے تقریباً تمام ناقدین نے فانی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے اور ان کی غزل سرائی کو سراہا ہے۔ احتشام حسین لکھتے ہیں:-

"اگر کوئی غزل گو ہمارے سامنے زندگی کے مسائل۔ محبت کے مسائل ان کی پیچیدگیاں اور ان کے حل، پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے تو اس کی شاعری موجودہ دور کے لوگوں کے لیے بھی اپنے دامن میں کچھ بجلیاں رکھتی ہے۔ فانی کے یہاں ایسی بہت سی بجلیاں ہیں۔" [۱]

آل احمد سرور کہتے ہیں:-

"یہ غلط ہے کہ ان کے اشعار زندگی سے زندگی کرنے کا حوصلہ چھین لیتے ہیں، وہ طبیعت میں ایک خاص گداز، فطرت میں بصیرت اور احساس میں ایک خاص گہرائی پیدا کرتے ہیں۔ زندگی میں ان چیزوں کی بھی ضرورت ہے۔"

میکش اکبرآبادی کا خیال ہے

"میری رائے میں فانی، نظیری نیشاپوری اور میر و غالب اکبرآبادی کا بہترین امتزاج ہیں" [۳]

---

۱ تا ۳ ان اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو علی گڑھ میگزین (فانی نمبر)

جگر مراد آبادی کی رائے ہے۔

"فانی اور ان کی شاعری اس وقت بھی ایک زندہ حقیقت ہے اور ہمیشہ زندہ حقیقت رہے گی اور نمائشی چیزوں سے اتنی بلند نظر آئے گی کہ ہر نئے سے نئے ادب کو اس کے سامنے سر تسلیم خم کرنا پڑے گا۔"[1]

سیماب اکبرآبادی تحریر کرتے ہیں:۔

"کثرت مشق و مزاولت اور سیر حاصل مطالعے نے ان سے ایسے اشعار بھی کہلوائے ہیں جو ادب اردو کے جواہر پارے اور تخیل کے شاہکار کہے جاسکتے ہیں۔ گو ایسے اشعار ان کے مجموعہ کلام میں کم ہیں مگر تب بھی وہ اتنے ہیں کہ ایک شاعر کی حیثیت سے فانی کو ہمیشہ باقی رکھنے کے لیے کافی ہیں۔"[2]

زاق گورکھپوری

"فانی کی غزل وہ حسین کمزوریاں، وہ نازک بےبسی، وہ پرخلوص و معصوم سعی بے حاصل اپنے اندر رکھتی ہے کہ آج بھی، کل بھی پرسوں بھی اور شاید دنیا کے بدل جانے پر بھی اس پر زندگی کے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی آنکھیں پڑتی رہیں گی اور کبھی کبھی اس طرف کان لگ جایا کریں گے۔"[3]

ظفر احمد صدیقی

شاعر کو شاعر کی زندگی کا آئینہ کہا جاتا ہے اور شعرا کے متعلق یہ نظریہ صحیح ہو یا نہ ہو۔ لیکن فانی کی شاعری پر حرف بہ حرف پورا اترتا ہے۔[4]

---

[1] تا [4] ان اقتباسات کے لیے ملاحظہ ہو علی گڑھ میگزین (فانی نمبر)

اسی کے ساتھ کئی تنقید نگاروں نے ان کی شاعری کے آہنگ کو میر اور غالب سے قریب بتایا ہے۔ چنانچہ پروفیسر سرور ان کے کلام پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ لے ان کو میر کے بہت قریب کر دیتی ہے۔ دوسری جگہ لکھتے ہیں کہ فانی، غالب کی طرح حساس ہیں۔ میکش صاحب کی رائے اور گذری، مولانا حامد حسن قادری کا بھی یہی خیال ہے۔ سیماب صاحب نے بھی ان کے یہاں میر و غالب کے رنگ کا نمایاں ہونا بتایا ہے[1]۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ ان رایوں میں حقیقت کی ادھوری ترجمانی ہے۔ یہ درست ہے کہ فانی کی شاعری میں جو گداز اور ان کی فکر کا جو انداز ہے وہ ہمیں میر و غالب کی یاد دلاتا ہے۔ تاہم ان کا غم میر کے غم سے زیادہ لطیف، اور ان کی تخیل غالب کی تخیل سے زیادہ گہری ہے جیسا کہ آپ آئندہ سطور میں ملاحظہ کریں گے۔ احتشام صاحب نے بڑی حد تک حقیقت کی ترجمانی کی ہے جہاں انھوں نے کہا ہے کہ :-

"کہا جاتا ہے کہ فانی کے یہاں میر کے گداز اور غالب کے علو کا امتزاج ہے۔ ممکن ہے ایسا بھی ہو۔ لیکن فانی، میر اور غالب میں سے کسی سے قریب ہوں یا نہ ہوں۔ اپنی ذات سے بہت قریب تھے اور اسی کی ترجمانی نے ان کی شاعری میں اثر پیدا کر دیا ہے[2]۔"

اسی حقیقت کی طرف مجنوں گورکھپوری نے بھی اشارہ کیا ہے۔ "فانی اور میر اور غالب کے درمیان مواد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے بہت قرب اور شدید اندرونی ربط ہے پھر بھی فانی ہم کو اردو غزل میں ایک بالکل نیا راگ معلوم ہوتے ہیں۔ اور میر اور غالب کی شاعری اپنے تمام نئے پن اور

---

[1] و [2] ملاحظہ ہو علی گڑھ میگزین فانی نمبر

اپنی ساری انسانی ہمہ گیری کے ساتھ بھی اگلے وقتوں کی چیز معلوم ہوتی ہے۔[1]
یہ اپنی ذات سے قریب ہونا بہ یک وقت شاعر کی انفرادیت اور اس کے تجربات کی صداقت کی واضح دلیل ہے۔

ہمارے ناقدوں کا پرانا طریقہ یہ ہے کہ جب کسی شاعر یا ادیب پر تبصرہ کرنے بیٹھتے ہیں۔ تو اس کو بڑھانے اور اس کے ہم عصروں کو گھٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ موازنہ کا ایک غلط طریقہ یہ بھی ہے کہ بے ضرورت دو ہم عصر شاعروں میں مطابقت پیدا کرنے کی سعی کی جاتی ہے۔ چنانچہ میر کا سودا سے۔ آتش کا ناسخ سے۔ غالب کا ذوق سے موازنہ کرنے کا عام رواج ہے۔ حالانکہ نظرت شعر کا نباض جانتا ہے کہ ان لوگوں کے رنگ جدا۔ انداز الگ۔ مزاج مختلف اور ماحول شعری جداگانہ تھے۔ اگر موازنہ کی رسم کو جائز قرار دیا جاسکتا ہے تو میر اور فانی کا موازنہ بھی ممکن ہے۔ سو اصدی کے طویل وقفہ کے باوجود ایک دوسرے سے قریب ہیں مگر اس موازنہ سے ہرگز یہ مراد نہیں کہ اس کی بنا پر کسی شاعر کی تنقیص کی جائے۔ صرف مقصد یہ ہے کہ دونوں باکمال شاعروں کے یہاں غم کی نوعیت کیا ہے؟ اور دونوں نے غم کے ساتھ اور غم نے ان دونوں کے ساتھ کیا سلوک کیا؟ وہ کون سے خیالات اور تاثرات ہیں جن کی بنا پر ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہیں اور وہ کون سے محرکات ہیں جو ایک کو دوسرے سے جدا کرتے ہیں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے۔

کس ماجرائے بلبل و پروانہ حل نہ کرد سرگشتہ اند ہر کہ بہ ایں ماجرا رسید

---

[1] غزل سرا

فانی اور میر دونوں کو غم سے سابقہ رہا۔ مگر ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہیں۔ دونوں کے یہاں محرکات غم مختلف ہیں۔ دونوں کے حالات اور ماحول جداگانہ تھے۔ جہاں دونوں میں یک گونہ مطابقت پائی جاتی ہے۔ وہاں بھی آرٹ کے اختلاف نے دونوں کو جدا کر دیا ہے۔ ہر بڑا شاعر ایک خاص قسم کی انفرادیت کا حامل ہوا کرتا ہے اور یہی انفرادیت اس کے درجہ کا تعین کرتی ہے۔

میر کا وہ زمانہ ہے جب دلی کی سیاسی فضا نادر شاہ اور احمد شاہ کے حملوں سے گونج رہی تھی۔ مسلمانوں کے سیاسی اقتدار کا چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ یہ مریض ناتواں چند ہچکیوں میں روداد زندگی سنا کر ختم کرنے والا تھا۔ ظاہر میں مغلیہ سلطنت کا تاجدار شہنشاہ ہندستان تھا مگر زندگی نے وہ دردناک منظر بھی دیکھا جب تاجدار ہند کے اقتدار کی حدود صرف از دلّی تا پالم تھیں اور شہنشاہ کبھی مرہٹوں اور کبھی روہیلوں کے رحم و کرم پر تھا۔ معاشی سیاسی مذہبی اور اخلاقی حالت دگرگوں تھی۔ زمانہ کا ہر لمحہ ایک عظیم الشان انقلاب کی خبر دے رہا تھا طوائف الملوکی کی وجہ سے ہر شخص اپنی جگہ پریشان اور ہراساں تھا۔ جہاں عیش و عشرت کی گہما گہمی تھی۔ وہ محفلیں اجڑ گئیں۔ میر کی زبان سے خدا برباد دلی کی روداد سنیئے۔

چیسے والے جو تھے ہوئے ہیں فقیر — تن سے ظاہر رگیں ہیں جیسے لکیر
ہیں معذب غرض صغیر و کبیر — مکھیاں سی گریں ہزار فقیر

دیکھیں ٹکڑا اگر برابر ماش

یہ وہ حالات ہیں جن میں میر جنم لیتے ہیں۔ کساد بازاری کا یہ عالم اور اس

پر میر صاحب کا نازک دل شیشہ پتھروں سے کیونکر نباہ کر سکتا تھا۔ ٹوٹا اور اس طرح ٹوٹا کہ پھر درست نہ ہو سکا۔ قدرت نے اسی پر بس نہیں کی بلکہ غمزدہ دل کو ابھی کچھ اور نشتر عطا کرنے تھے۔ غم دوراں کے ساتھ غم جاناں کا بھی روگ لگ گیا شاید زمانے کے تغیرات سے مصالحت بھی ہو جاتی مگر عشق و محبت کی ناکامی نے افسردہ چنگاریوں کو اور بھی مشتعل کر دیا۔ عزیزوں کی بے وفائی اس پر تازیانہ تھی۔ طبیعت درویشانہ تھی۔ زمانہ کی بے ثباتی اور تغافل کے باعث، دنیا کی ناپائیداری اور انسانوں سے بیزاری کے خیالات پیدا ہوئے۔ یہی سبب ہے کہ میر کے یہاں مردم بیزاری، قناعت، جبر، غم پرستی اور تسلیم پسندی، شاعری کے موضوعات کی حیثیت سے آئے۔ یہ ضرور ہے کہ جب ان کی ذاتی صلاحیت بروئے کار آتی ہے تو وہ مردم بیزاری کے باوجود عظمت انسانی کے بھی مداح نظر آتے ہیں۔

فانی کے زمانہ میں طوائف الملوکی نہ تھی۔ زمانہ ایک متوازن اور ہموار راہ سے گذر رہا تھا اسی زمانہ میں نہ بیرونی حملوں کا ڈر تھا اور نہ اندرونی خلفشار کا خوف بلکہ قلوب کافی حد تک انگریزوں کی غلامی سے مطمئن ہو گئے تھے۔ سیاسی اور سماجی حالات ایسے نہ تھے جو ان کے یہاں کسی 'شہر آشوب' کو جنم دیتے۔ البتہ میر کی طرح فانی کو بھی احباب اور اہل وطن سے شکوہ رہا ہے۔ ان کے یہاں بھی کسی ناکام محبت کی خلش موجود ہے۔ ان کا غم ایک حد تک ذاتی ہے۔ ان کے غم کے تجربات عام سہی مگر ان کے پیرایۂ اظہار کو کبھی فانی نے عام نہ ہونے دیا۔ یہی سبب ہے کہ پڑھنے والا جو یگانگت میر کے غم میں پاتا ہے فانی کے غم میں نہیں پاتا۔ مگر ان نامرادیوں اور حرماں نصیبوں کے باوجود فانی دیوار کے سائے

ہیں دامن کو منہ پر لے کر سونے کی تمنا نہیں کرتے۔ غالباً ان کی حرماں نصیبی میں اعتدال پیدا کرنے والی شے پہلے ان کا تصوف ہے جو عملی نہ ہونے کے باوجود نظری تو ہے اور دوسرے ان کا فلسفیانہ زاویہ نظر ہے جس نے ان کی فکر کو عزیمت اور ان کے غم کو رفعت بخشی ہے۔ اور غم کی یہی منزل ہے جہاں سے میر اور فانی کے راستے جدا ہوتے ہیں۔

میر اور فانی کے غم میں نمایاں فرق یہ بھی ہے کہ جب غم و آلام کی افتاد میر پر پڑتی ہے تو وہ اس کو جس شدت سے محسوس کرتے ہیں اسی شدت کے ساتھ اظہار کر دیتے ہیں۔ وہ فانی کی طرح اس کے اسباب وعلل پر سوچتے ہوئے نظر نہیں آتے یہی وجہ ہے کہ جس سادگی اور روانی سے اپنے جذبات کا اظہار میر نے کیا وہ فانی کے یہاں نہیں ہے صداقت دونوں کے یہاں ہے اور اسی عنصر نے ان کے تجربات کی اہمیت بڑھا دی ہے۔ فرق یہ ہے کہ ایک کے کلام میں جذبات کا عامیانہ بے ساختہ اظہار ہے اور دوسرے کے جذبات پر فکر کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ میر کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

اک شخص مجھی سا تھا کہ تھا تجھ سے پہ عاشق — وہ اس کی وفا پیشگی وہ اس کی جوانی
یہ کہہ کے میں رو دیا تو لگا کہنے نہ کہہ میر — سنتا نہیں میں ظلم رسیدوں کی کہانی

پتہ پتہ بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے — جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
اس موج خیز دہر میں تو ہے حباب سا — آنکھیں کھلیں تری تو یہ عالم ہے خواب سا

بعد ہمارے اس فن کا جو کوئی ماہر ہووے گا
درد آگیں انداز کی باتیں اکثر پڑھ پڑھ رووے گا

اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اشعار نہ صرف میر کے بلکہ اردو شاعری کے نشترون میں سے ہیں۔ مگر کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غم و اندوہ کی وہی پرانی ڈگر ہے جس پر ہمیشہ شاعری کے کارواں چلتے رہے ہیں۔ میر کی انفرادیت یہ ہے کہ ان کے خلوص جذبات اور حسن ادا نے ان کو نئی زندگی بخشی مگر غم کو عرفان غم میں تبدیل کرنا صرف فانی کا حصہ ہے۔

یہ واقعہ ہے کہ میر اور فانی کی زندگی اور شاعری میں کئی لحاظ سے مماثلت پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ دونوں کے زمانۂ وفات میں سوا صدی سے زیادہ کا بعد ہے۔ اس مدت میں کتنے خارجی اور داخلی عوامل بروئے کار آئے اور اردو شاعری کے ارتقا نے کتنی منزلیں طے کیں یہ مسئلہ تاریخ کے ہر طالب علم سے غور و فکر کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر اگر ہم میر اور فانی کے غم پر نگاہ ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ میر کے یہاں غم کا ایک عامیانہ تصور ہے۔ ان کے جذبات میں صداقت اور صداقت کے ساتھ اثر ضرور ہے لیکن رفعت نہیں۔ وہ درد و کرب سے چیخ پڑتے اور اپنے نالہ و آہ سے سننے والوں کو بے تاب کر دیتے ہیں لیکن ان کی شاعری میں غم کا حکیمانہ تجزیہ، جو غم کو قدرت کا انعام اور اپنی دولت سمجھے اور اس کو محبوب جان کر اس کا خیر مقدم کرے نہیں ملتا۔ یہ ضرور ہے کہ وہ اپنی شاعری کو شاعری نہیں بلکہ درد و غم کی روداد قرار دیتے ہیں۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے　　درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

ان کے درد و غم کی شدت دیکھنا ہے تو ذیل کی مثالوں پر نظر ڈالیے

• بے دماغی، بے زاری، بے کسی، بے طاقتی　　کیا جئیں وہ جن کے جی کو روگ یہ اکثر رہیں

میں سیاسی حیثیت کے ساتھ یہ امتیاز اور بھی نمایاں ہو گیا۔ سلطنت دہلی کے آغاز ہی سے بیرون ہند سے آنے والے علماء۔ مشائخ، صوفیہ اور شعرا نے اس خطے کو اپنا وطن بنایا اور ان کے آثار اور یادگاریں ایک طرف معاصر تاریخ کے صفحات میں محفوظ اور دوسری جانب تاریخی آثار و مزارات کی صورت میں آج بھی عقیدت و احترام کا نذرانہ وصول کر رہی ہیں قدیم بزرگوں میں حضرت میران ملہم شہید۔ حضرت بدرالدین مہتاب حضرت سلطان العارفین۔ حضرت سید احمد (حضرت نظام الدین اولیا کے والد ماجد)۔ علما اور شعرا میں مولانا علاء الدین اصولی۔ مولانا شہاب الدین مہرہ (استاد حضرت امیر خسرو) حسن سنجری۔ ضیاء الدین نخشبی اور ایسے متعدد نام ملتے ہیں۔ جنھوں نے اس دور میں بدایوں کو قبتہ الاسلام کے لقب کا مستحق قرار دیا تھا۔ مغل عہد میں بدایوں کو وہ مرکزیت تو حاصل نہ رہ سکی جو اس سے قبل تھی۔ لیکن علم و فضل تقویٰ اور دینداری اور شعر و ادب کی وہ شمعیں جو اگلوں نے روشن کی تھیں اپنی ضیا باری سے سرزمین ہند کو مطلع انوار کرتی رہیں۔ اس دور کے اہل علم و فضل میں ملا عبدالقادر البدائونی کا نام سیاسی اور تاریخی اسباب کی بنا پر نمایاں نظر آتا ہے۔ یہ باور کرنے کے لیے کھلی شہادتیں موجود ہیں کہ کسی دور میں بدایوں کا دامن ایسے گہرہائے آبدار سے خالی نہیں رہا جنھیں اگر مواقع میسر آتے تو ملک گیر شہرت کے مالک ہوتے۔ یہ خصوصیات صرف بدایوں کے قدیم خاندانوں تک محدود نہ تھی۔ بعد کے ادوار میں باہر سے آکر یہاں بس جانے والے لوگ بھی انھی روایات کو اختیار کر کے اسی رنگ میں رنگ گئے تھے۔ اور چند پشتیں گزر جانے

روئے یار لایا اپنی تو یوں ہی گذری
کیا ذکر ہم صفیراں یارانِ شادماں کا

اب تو افسردگی ہی ہے ہر آن
وے نہ ہم رہیں نہ وے زمانے ہیں

آبلے کی سی طرح ٹھیس لگی پھوٹ بہے
دردمندی میں گئی ساری جوانی اس کی

ان اجڑی ہوئی بستیوں میں دل نہیں لگتا
ہے جی میں وہیں جا بسیں ویرانہ جہاں ہو

دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے
پچھتاؤگے سنو ہو یہ بستی اجاڑ کے

روشن ہے اس طرح دلِ ویراں میں داغ ایک
اجڑے نگر میں جیسے جلے ہے چراغ ایک

دامان کوہ میں جو میں ڈاڑھ مار رویا
اک ابر واں سے اٹھ کر بے اختیار رویا

ٹک میر جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغ سحری کا

دل بہم پہنچا بدن میں تب سے ہر یہ تن جلا
آپڑی یہ ایسی چنگاری کہ پیراہن جلا

میر کی استادی میں کوئی شبہ نہیں۔ ان کے کلام میں بہتّر نہیں اس سے کہیں زیادہ نشتر نکل آئیں گے۔ اوپر دیے ہوئے اشعار میں بھی متعدد شعر ان کی شاعرانہ عظمت کے ثبوت میں پیش کیے جاسکتے ہیں۔ لیکن وہ ندرت، وہ لطافت اور وہ رفعت جو فانی کے یہاں ملتی ہے ان کے یہاں نہیں ہے۔ متقدمین سے لے کر عہد حاضر تک سیکڑوں شعرائے (بعض نے واقعی طور پر اور اکثر نے بہ تکلف) درد و غم کی داستان دہرائی ہے۔ مگر اس ژرف نگاہی کی مثالیں نہ ہونے کے برابر ہیں اس کے لیے ایک حساس دل اور ایک فلسفیانہ نظر کی ضرورت ہے اگر ایک وصف ہے مگر دوسرا نہیں تو شعر یا تو عامیانہ ہو کر رہ جائے گا یا خشک ہاں جب دونوں کا امتزاج ہوگا تو شعر میں رفعت اور شعریت پیدا ہو جائے گی۔ آیئے غم کے موضوع پر فانی کی نکتہ سنجیاں ملاحظہ کیجیے۔ لوگ عشرت دو روزہ

یا حسرت دیروز پر جان دیتے ہیں ان کو کیا معلوم کہ یہ غم ہی کے ارتقا کی ابتدائی منزلیں ہیں۔

یا عشرت دو روزہ تھا یا حسرت دیروز　　وہ لمحہ ہستی جو ابھی غم نہ ہوا تھا

وہ رنج زیست کو بھی کرم سے تعبیر کرتے ہیں مگر ان کی ہمت عالی اس پر قانع نہیں اور رنج جاوداں کی طالب ہے۔

تو نے کرم کیا تو بہ عنوان رنج زیست　　غم بھی مجھے دیا تو غم جاوداں نہ تھا

اسی مضمون کو دوسری جگہ باندھا ہے۔

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں　　مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

غم سے اگر کوئی شخص بے زار ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کو مصلحت ایزدی پر اعتراض ہے۔

زہے تقدیر ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری　　تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

دراصل راضی برضا رہنے والوں کی یہی شان ہے۔ یہی نہیں بلکہ ان کے نزدیک غم خدا کا کرم ہے جو ہر کسی کے حصہ میں نہیں آتا

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا
مگر من جملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو　　میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

دل اور غم اصل میں دو حقیقتیں نہیں۔ بلکہ ایک ہی حقیقت ہے جس کے دو نام ہیں۔ دل غم سے خالی رہے یہ غیر ممکن ہے۔

جلوۂ آتش پنہاں جسے غم کہتے ہیں　　دل ہوا بجھ کے وہی شعلۂ عریاں میرا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں رازِ کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں
درد جب تک نہ ملے دل نہیں ہونے پاتے

فانی کا جنونِ عشق در و دیوار کے علائق سے بے نیاز ہے۔

اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یارب در و دیوار دئے اب انھیں ویرانی دے

وہ تقدیر کے شکر گذار ہیں جس نے ان کی محنت بچا دی اور گھر کو ویرانی بخشی

گھر خیر سے تقدیر نے ویرانہ بنایا سامان جنوں مجھ سے فراہم نہ ہوا تھا

غم یا درد کی عظمت کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ خدا کی دین ہمارے ظرف سے کہیں افزوں تر ہوتی ہے۔ مجھی کو دیکھو کہ میرے دل کی کیا بساط تھی۔ لیکن منعم حقیقی نے اس کو درد کی اتھاہ دولت بخش دی۔

خدا کی دین نہیں ظرف خلق پر موقوف یہ دل بھی کیا ہے جسے درد کا خزانہ ملا

غم ہی جی کا دشمن تھا غم سے دور رہتے تھے غم ہی رہ گیا آخر ایک غم گسار اپنا

لیکن یہ غم کون سا غم ہے فانی کی زبان سے سنیئے۔

دم بھی فانی کسی کے غم تک ہے دم نہ ہوگا اگر یہ غم نہ ہوا

جو محبوب کے جلوے سے دگو ایک لمحہ ہی کے لیے) بہرہ یاب ہوتے ہیں وہی اس دولت کے حق دار ٹھہرتے ہیں۔

فیض یک لمحۂ دیدار سلامت فانی غم ہر روز ہے بڑھتی ہوئی دولت میری

یوں تو دل کی کچھ ایسی بساط نہ تھی مگر اسی غم کی بدولت اب اس کا یہ مرتبہ ہوگیا کہ خود غم دست اس کا احترام کرتا ہے۔

جبیں درد ہے بے تاب سجدہ اے فانی کدھر ہے خاک ترے دل کے آستانے کی

زندگی یاد دوست سے عبارت ہے اور یاد دوست فانی کے نقطۂ نظر سے غم دوسرا نام ہے۔

زندگی یاد دوست ہے یعنی زندگی ہے تو غم میں گزرے گی

اس کے ہوتے ہوئے وہ نشاط وصل کے بھی طالب نہیں۔

دل کو یاد نشاط وصل نہ چھیڑ غم میں گذری ہے غم میں گذرے گی

دل اور ہوائے سلسلہ جنبانیٔ نشاط کیوں پاس وضع غم تجھے غیرت نہیں آتی

غم کی اس لذت کوشی نے موت کو شاعر کے لیے ایک دل پسند اور محبوب چیز بنا دیا ہے کیونکہ اس کی بدولت راہ کے کانٹوں سے بچ کر گل مراد دوست تک رسائی ممکن ہے۔ موت دنیا والوں کے لیے بھیانک ہو تو ہو ان کے لیے ایک عروس زیبا سے کم نہیں۔ قاعدہ ہے کہ محبوب تک پہنچنے کا وسیلہ بھی محبوب ہو جاتا ہے۔

ادا سے آڑ میں خنجر کی منھ چھپائے ہوئے مری قضا کو وہ لائے دلھن بنائے ہوئے

ایک جگہ فرماتے ہیں۔

آتی رہے گی خیراب اس زندگی کو موت یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

ایسے نازک اور دلکش نشتر فانی کے یہاں بکثرت ہیں۔ شاعر نے زندگی سے خفا ہو کر موت کو اپنی زندگی قرار دے لیا ہے مگر زندگی سے (برائے نام ہی سہی) اتنا ربط بھی گوارا نہیں۔ یا تو خود خلش پیدا ہوئی یا کسی دل جلے نے طعنہ دیا کہ زندگی سے یہ علاقہ بھی کیوں۔ اس کا معاً جواب دیتا ہے۔ ع

"آتی رہے گی خیراب اس زندگی کو موت"

یہ خیال پوری اردو شاعری میں شاید ہی کسی کے یہاں نظر آئے اس پر

قدرت زبان کا یہ عالم کہ فصاحت قربان ہوئی جاتی ہے "یہ تو ہوا" یعنی اس حد تک تو کامیابی ہوگئی "آتی رہے گی خیر" یعنی پوری امید ہے۔ ایسی کیا جلدی پڑی ہے۔ جو شخص زندگی کو شب فرقت کی طرح ناگوار سمجھتا ہو وہی کہہ سکتا ہے۔

شب فرقت کٹی یا عمر فانی — اجل کے ساتھ آمد ہے سحر کی
جب دیکھئے جی رہا ہے فانی — اللہ رے اس کی سخت جانی
آج روز وصال فانی ہے — موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز
مرگ فانی میں اب تو دیر نہ کر — سہل فرمانے والے مشکل کے
لذت فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی — دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے
فانی دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور — غافل نہیں کہ اس سے تقاضا کرے کوئی

خدا چاہے تو مردوں کو زندہ کر سکتا ہے۔ فانی کی قوت یقین کو اس کے ماننے میں کوئی تذبذب نہیں۔ وہ کہتا ہے۔ تجدید زندگی تو محالات سے نہیں البتہ اس کو یہ خیال ضرور آتا ہے کہ ع

"فانی مگر یہ ان کی مروت سے دور ہے"

موشگافی کرنے والے حضرات اس میں کہیں انکار حشر کا پہلو نہ ڈھونڈیں۔ شاعر اس عالم کی زندگی کا طالب نہیں ورنہ اس عالم کی زندگی ایک عاشق کو کیوں ناپسند ہونے لگی۔ اس کی نگاہ میں تو موت کا دن روز وصال کا نام ہے۔

ہر شخص کلام فانی کو پڑھنے کے بعد اس نتیجہ پر پہونچے گا کہ ان کے یہاں غم کا مفہوم میر کے غم سے کہیں لطیف اور دقیق ہے اور ان کی شاعری میں موت کا بیان ایک زمانے کے لکھنؤ کی میت اور کفن سے بہت بلند اور ارفع ہے یہ سچ ہے کہ ابتدائی دور میں لکھنؤ کے قیام کے اثر سے وہ بھی اس رنگ کی

طرف مائل ہوئے تھے۔ مگر شکر ہے کہ جلد کنارہ کش ہو گئے ورنہ اردو ایک انفرادیت پسند شاعر کی زندہ جاوید تخلیقات سے محروم رہ جاتی۔

اب پھر ہم میر اور فانی کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ ہماری قطعی رائے ہے کہ میر کے غم میں شدت ہے اور فانی کے غم میں لطافت۔ وہ سادگی کے خوگر ہیں یہ دقیقہ سنجی کے۔ ان کے یہاں بھی صداقت ہے اور ان کے یہاں بھی۔ وہ نمیاً سختہ گراہ کے عادی ہیں یہ ضبط آہ کے۔ وہ درد سے بے قرار ہیں اور یہ درد کے لئے بے قرار۔ اب سوال یہ ہے کہ فانی نے غم کو کیوں اپنایا۔ ان کو یہ سوز خوانی کیوں پسند آئی۔ انھوں نے زندگی کا متشائم پہلو کیوں اختیار کیا اس کے جواب کے لیے ذیل کے حقائق کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ہمیں کسی شاعر کی شاعری کو کسی خاص موضوع یا اسلوب کا پابند کرنا کیونکر روا ہے۔ یہ اعتراض اگر بجا ہے تو ہر شاعر پر کم و بیش یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے۔ میر پر جنھوں نے بقول خود کتنے ہی درد و غم جمع کئے تب دیوان وجود میں آیا۔ فردوسی پر کہ انھوں نے رزم کو اپنایا سعدی نے اخلاقیات کو، حافظ نے سرمستی کو۔ غالب نے فلسفیانہ فکر کو۔ مومن نے تغزل کو۔ داغ نے محبوب سے چھیڑ چھاڑ کو۔ ریاض نے خمریات کو۔ اصغر نے نشاط کو، اپنے موضوع شعر کی حیثیت سے کیوں انتخاب کیا۔ اصل یہ ہے کہ نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ شاعر ایک انسان اور حساس انسان ہے اور انسان کا اپنے دور حیات میں سیکڑوں داخلی اور خارجی عوامل سے متاثر ہونا روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ البتہ ایک اچھا شاعر اپنے محسوسات کو ایسے خاص انداز میں پیش کر دیتا ہے کہ سننے والے دل تھام کر رہ جاتے ہیں۔

ان کے یہاں شاعری کے علاوہ ورائے شاعری ایک ایسی چیز بھی ہوتی ہے جو ان کی انفرادیت کی ضامن کہی جا سکتی ہے۔ خواہ آپ اس کو شعریت کے نام سے یاد کریں یا اثر کے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس کے بغیر شعر صحیح معنی میں شعر نہیں کہا جا سکتا۔ کسی نے بہت خوب کہا ہے کہ:

محبت ہو کسی سے یا عداوت مزا دے جائے گی جو دل سے ہوگی

دوسرے یہ امر بھی ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ غم کوئی عیب نہیں۔ اس کا بھی انسانی زندگی میں ایک مقام ہے۔ وہ ایک ایسا محرک ہے جو انسان کی طبیعت میں گداز، نگاہ میں بصیرت اور جذبات میں پاکیزگی کا ذمہ دار ہے مسعود حسن رضوی کا غم کے بارے میں خیال ہے۔

"اب رہا غم تو وہ شاعری کے لیے خوشی سے کہیں بہتر موضوع ہے اس لیے کہ خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی ہے اور غم بلند ترین حسیات کو بیدار کرتا ہے۔ کامیڈی کے مقابلے میں ٹریجیڈی کی افضلیت کا راز یہی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ غم کے جذبات میں وہ زور ہوتا ہے کہ شاعر ان کے اظہار پر مجبور ہوتا ہے۔ خوشی میں یہ طاقت کہاں[1]"

کوئی بات تو تھی جب شبلی نے کہا تھا۔

OUR SWEFTEST SONGS ARE THOSE
WHICH TELL OF SADDEST THOUGHTS

بہت سے سالکان طریق کو عرفان کی منزل غم ہی کی راہ سے ملی ہے۔ بقول حضرت

---

[1] ہماری شاعری۔ پروفیسر مسعود حسن رضوی۔

رضی بدایونی

لائی ناکامیٔ دل منزل جاناں کے قریب انکے جلوے تھے سراپردۂ حرماں کے قریب

اس سے قطع نظر فانی کی شخصی زندگی جوانی سے تا آخر عمر درد و غم کا مرقع تھی بلکہ کہنا چاہیئے کہ درد و غم ہی ان کی زندگی بن گئے تھے۔ عشق کی ناکامی۔ ماحول کی بے مہری، وطن کے مصائب۔ غربت کے شدائد نے ان کو پیکر الم بنا دیا تھا۔ یہاں تک کہ غم ان کا رفیق اور موت ان کا سہارا بن کر رہ گئی۔ ان حالات میں ان سے غم کی آہ کی جگہ طرب کے قہقہے کی امید رکھنا دائرے کو مربع میں تبدیل کرنے کی کوشش ہے۔ یہ کیا کم ہے کہ فانی کی سحر طرازی نے غم کو مرغوب اور موت کو محبوب بنا دیا۔ اور ان کی تلخی اور دہشت انگیزی ان سے چھین لی۔ ایسا نہیں کہ یہ امور محض برائے گفتنی ہوں۔ یہ سب فانی کے دل کی آواز تھی ان کی شاعری کو کسی شاعر نے روایتی نہیں کہا ہے ان کی شاعری حقیقی ہے اور ان کی زندگی سے ہم آہنگ۔

اٹھا دیا ہے مجھے سمجھ لیں گے دل کسی و لہ و الہو تو کریں

اب رہا یہ امر کہ آیا جو کچھ انھوں نے کہا وہ سلیقہ سے کہا اور ان کا بیان غم شعریت سے بھر پور رہے یا اس کے برخلاف خشک اور سپاٹ ،اس کی نسبت فانی کے مندرجہ بالا اشعار اور ان کی تشریح پر ایک بار پھر نظر ڈالیں تو آپ تسلیم کریں گے کہ فارسی غزل میں معدودے چند کو چھوڑ کر اردو غزل کے تمام سرمائے میں فانی کی شاعری نے اپنے لیے سب سے اونچا مقام حاصل کر لیا ہے۔ اور چونکہ اب یہ جنس بازار سے ناپید ہو گئی ہے اس لیے آئندہ ان کی انفرادیت کو کوئی خطرہ نہیں ہے۔ تعجب ہوتا ہے جب بعض نقاد کہتے ہیں

فانی زندگی سے فرار کھاتے ہیں۔ ان کی دنیا تنگ ہے اور انکی شاعری میں ایک تھکا دینے والی یکسانیت پیدا ہوگئی ہے۔ دراصل یہ وہی دل کے لہو نہ کرنے کی بات ہے۔ ان کے نزدیک شعر کسی خاص مقصد کے تحت وجود میں نہیں آتا وہ خود اپنا مقصد ہے۔ انھوں نے ایک تقریر میں کہا تھا۔

"شعر کے لیے پہلی اور آخری شرط شعریت ہے۔ یہ دل سے نکل کر دلوں سے ٹکراتی ہے"

اگر یہ مقصد حاصل ہوگیا تو پھر کسی دوسرے مقصد کی تلاش بے سود ہے یہی وجہ تھی کہ وہ اقبال کے قائل نہ تھے خود اقبال نے بھی اس زاویہ نظر کو جو فانی کے یہاں ملتا ہے پسندیدہ نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ یہ وہ نقطہ ہے جہاں ہمارے یہ دو بڑے باکمال شاعر ایک دوسرے سے جدا ہو جاتے ہیں۔ اور دونوں اپنی جگہ صحیح ہیں۔ دونوں میں ہر ایک خلوص جذبات۔ رفعت فکر اور کمال فن کی دولت سے مالا مال ہے۔ دونوں نے اپنا دل لہو کیا تھا۔ ایک نے اس لیے کہ اس لہو سے خود اپنا رنگ رخ تازہ ہو اور دوسرے نے اس غرض سے کہ وہ اس کی ملت کے ناموس کے چہرے کا غازہ ہو۔

اوپر جو بحث گذری اس کو بظاہر تو میر اور فانی کا موازنہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں کی خوبیاں اور خامیاں دکھائی گئی ہیں۔ لیکن درحقیقت یہ موازنہ نہیں ہے کیونکہ موازنہ میں اکثر اوصاف میں اشتراک پایا جانا ضروری ہے۔ اور یہاں اشتراک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دونوں کاملین فن کے درمیان سو اصدی سے زیادہ کا فرق نمایاں ہے۔ زمانے کے تجربات۔ ملک کے بدلتے ہوئے حالات۔ ماحول اور طبیعت کے گوناگوں اثرات کا فرق معمولی نہیں ہے یہ دراصل

ایک آئینہ ہے جس میں دو بڑے شاعروں کے خط و خال جیسے نظر آئے ویسے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

غالب کی شاعری اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ تقریباً تمام ناقدین نے ان کو خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ کون سی خصوصیت ہے جس نے ان کو یہ مقام بخشا۔ فکر۔ جذبہ واردات قلب کی مصوری۔ طرز بیان کی ندرت۔ حقائق کائنات کا مطالعہ۔ بدلتے ہوئے سماج کا شعور۔ اپنے ماحول کا تجزیہ۔ یوں تو ان تمام خصوصیات کا غالب کو غالب بنانے میں کم و بیش دخل ہے۔ مگر ہمارے نزدیک ان کی فکر کو ان سب پر تفوق حاصل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک جاگیردارانہ نظام کے زوال آمادہ دور کی پیداوار تھے جس کا ظاہر کبھی پرسکون اور کبھی متلاطم رہتا تھا۔ لیکن اس کے باطن میں سیکڑوں طوفان کروٹیں لے رہے تھے۔ یہ درست ہے کہ جب ۱۸۵۷ء میں اس نظام کی بساط الٹی تو ان کو چنداں حیرت نہ ہوئی۔ اور ملال بھی ہوا تو ہندستانیوں اور انگریزوں میں سے اپنے ذاتی دوستوں کی ہلاکت اور بربادی کا۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ وہ اپنے سفر کلکتہ میں انگریزی طرز زندگی کی جھلک دیکھ آئے تھے۔ جس کی تعریف میں وہ آخر تک رطب اللسان رہے مگر یہ تو مظاہر و مناظر تھے جن سے تھوڑا بہت ہر شخص اپنی جگہ متاثر ہوا ہوگا۔ غالب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے ان حقائق کا نہ صرف ادراک کیا بلکہ ان کو اپنی فکر کا جزو بنا لیا۔ ان کے عمل اور رد عمل سے ان کے خیال میں گہرائی اور ان کے جذبات میں توانائی آئی۔ اور ان پر

کے بعد خود بھی ان روایات کے امین بن گئے۔ ایسے ہی خاندانوں میں فانی کے گھرانے کا بھی شمار ہوتا ہے جن کے افغانی النسل اجداد شاہ عالم کے عہد میں یہاں آکر بس گئے تھے۔

فانی نے جس بدایوں میں آنکھ کھولی اور جس فضا میں اپنے ذہنی سفر کا آغاز کیا اس کے تفصیلی بیان کے لیے تو ایک دفتر چاہیئے۔ یہاں صرف چند نمایاں پہلوؤں کی طرف اشارہ کیا جا سکتا ہے۔ بدایوں کی اس فضا کی سب سے نمایاں خصوصیت یہاں کے لوگوں کی (جن میں ہندو اور مسلمان سبھی شامل تھے) مذہب اور مذہبی روایات سے گہری وابستگی تھی۔ شہر کے بعض محلوں میں ہندو اور مسلمانوں کی ملی جلی آبادی تھی۔ لوگ اپنی روایات پر سختی سے قائم رہنے کے باوجود باہمی رواداری اور خیر سگالی کے طریقے پر کاربند تھے۔ ایک دوسرے کے دکھ درد شادی غمی میں شریک رہتے تھے۔ اس ضمن میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بدایوں کی پوری تاریخ میں (دو ایک واقعات سے قطع نظر) فرقہ وارانہ محاذ آرائی کی وہ فضا کبھی پیدا نہیں ہوئی جس نے ہندوستان جنت نشاں کے بہت سے علاقوں کو نفرت اور تشدد کے جہنم میں ڈھکیل دیا تھا۔ اپنے ہی نہیں دوسرے فرقوں کے بزرگوں کا احترام ایک ایسی قابل قدر روایت تھی جس پر اہل بدایوں جتنا بھی فخر کریں کم ہے۔

مجلسی زندگی کے اعتبار سے بدایوں والوں کی ایک اپنی دنیا تھی جس پر باہر کی دنیا کے واقعات کم اثر انداز ہوتے تھے۔ یہ بے تعلقی خاص تاریخی عوامل کی بدولت پیدا ہوئی تھی۔ بعد کے ادوار میں جب جدید تعلیم اور سرکاری ملازمتوں کے حصول کی خاطر بدایوں کے لوگ زیادہ تعداد میں باہر جا کر بیرونی دنیا سے روشناس ہونے لگے تھے خاک وطن کی کشش پھر بھی دامن گیر رہتی تھی اور وطن واپس آکر اکثر

غالب کی فکر رسا کی چھاپ ہے۔ وہ ماحول کے ساتھ سوچنے پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ماحول کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں اس لیے نہیں کہتے کہ سننے والے سنیں اور سر دھنیں وہ اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی فطرت شعر کے روپ میں برانگندہ نقاب ہونا چاہتی ہے۔ اسی کے ساتھ یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی فکر پر تصوف کا بھی خاصا اثر ہے۔ بعض اصحاب کا خیال ہے کہ دہلی کے ماحول اور نواب الٰہی بخش خاں معروف کی صحبت نے ان کو صوفی مزاج بنا دیا۔ دوسروں کا بیان ہے کہ ان کے ذاتی مطالعے نے ان کو اس راہ پر لگا دیا۔ بنیاد جو کچھ بھی ہو لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ شیعوں کے باوجود تصوف سے سرشار تھے۔ وہ عملاً صوفی نہ سہی مگر ان کے یہاں تصوف دیکھ کر یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ وہ اعتقاداً بھی تصوف کے قائل نہیں ہیں۔ ان کے یہاں تصوف کا رنگ اس حد تک رچا بسا ہوا ہے کہ کہیں پر اجنبی نہیں معلوم ہوتے ایک خط میں لکھتے ہیں :۔

"یہاں لا موجود الا اللہ کے بادہ ناب کا رطل گراں چڑھائے ہوئے اور کفر و اسلام و نور و نار کو مٹائے ہوئے بیٹھے ہیں۔ کجا غیر و کو یغو کو نقش غیر۔ سوائے اللہ واللہ مانی الوجود"

تصوف اور فلسفہ کا رشتہ بہت قریب کا ہے۔ علامہ شبلی کہتے ہیں :۔

"فلسفہ جو شاعری میں تصوف کی راہ سے آیا۔ جب ہستی مطلق ـ وحدت الوجود۔ فنا۔ بقا وغیرہ مسائل اسی تصوف کی بدولت آشنا ہوئے تو چوں کہ دلچسپ مسائل ہے تمام طبیعتوں کو ان میں مزہ آتا ہے۔ لیکن ہر شخص صاحب حال نہیں ہو سکتا تھا اس لیے

جو لوگ معاشقہ اور حال کے زباں آموز تھے فلسفہ کا سہارا پکڑتے تھے۔ اور اسی کے سکھائے ہوئے الفاظ بولتے تھے۔ یہ لے بڑھتے بڑھتے پورا فلسفہ زبان میں آگیا۔[۵۱]"

غالب کو صاحب حال کہنا تو ممکن نہیں لیکن صاحب قال ضرور کہا جا سکتا ہے رہا یہ مسئلہ کہ وہ فلسفی شاعر تھے یا نہیں۔ اس بارے میں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جب ہم انھیں فلسفی کہتے ہیں تو ہماری یہ مراد ہرگز نہیں ہوتی کہ وہ کسی خاص نظام فکر یا فلسفیانہ سلسلہ کے بانی تھے جس کے محور کے گرد ان کی تخلیقات گھومتی ہیں بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ حقائق زندگی پر سنجیدگی سے سوچنے اور ان کو سلیقہ سے بیان کرنے کے خوگر تھے۔ یہ ہے غالب کی فکر کا ایک اجمالی خاکہ جس سے زیادہ کی ہمیں ان سے توقع کرنا درست نہ ہوگا۔ جب ہم فانی کے کلام کو غور سے پڑھتے ہیں تو اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ان کی گرفت فلسفیانہ اور صوفیانہ مسائل پر زیادہ محکم اور قوی ہے۔ بلکہ ان کے یہاں ان مسائل کے بیان میں شعریت بھی زیادہ دلکش اور جاذب توجہ معلوم ہوتی ہے۔ ان کی فکر غالب سے زیادہ گہری اور پیچیدہ نظر آتی ہے۔

فانی قدرت سے ایک سوچنے والا دماغ اور ایک حساس دل لے کر آئے تھے۔ ان کو فلسفے سے خاصی مناسبت تھی اور جہاں تک ہمیں معلوم ہوا انھوں نے فلسفہ کا کافی مطالعہ کیا تھا۔ وہ نسلاً پٹھان تھے اور ان کے خاندان کا شمار شہر کے معزز خاندانوں میں تھا۔ مگر فانی کو جوانی ہی میں زندگی کے نشیب و فراز

---

[۵۱] شعر العجم جلد پنجم

دوستوں کی بے مہری اور محبت کی ناکامی سے کام پڑا۔ ان عوامل کا ردعمل عموماً انسانوں کے طبائع پر مختلف وسائل و مسائل کے لحاظ سے مختلف ہوا کرتا ہے کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کے احساس پر واقعات و حالات تازیانے کا کام کرتے ہیں۔ دوسرے گروہ میں بھی بعض طبیعتیں عمل کا سہارا لیتی ہیں اور نتیجہ کچھ بھی ہو سعی سے کنارہ نہیں کرتیں۔ ع

کارِ من بہ دریا در دست و پا زدن تنہا

لیکن ان کے برخلاف کچھ ایسے افراد بھی ہوتے ہیں کہ سراپا احساس ہونے کے باوجود زندگی سے صلح کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ زمانے کی بے مہری اور اہل زمانہ کی ناقدری ان کو ان کے بلند نصب العین سے تجاوز کرنے پر مجبور نہیں کر سکتی فانی کا شمار اس آخری گروہ میں ہے۔ اسی کے ساتھ ان میں خودداری آزادہ روی۔ عالی ظرفی اور راست بازی کے اوصاف ایسے راسخ تھے کہ اس کی مثال ابنائے عصر میں مشکل سے ملے گی۔ یہی وہ محرکات تھے جنھوں نے ان کی سیرت کی تشکیل میں حصہ لیا یا انکی فطرت کو ایک خاص سانچے میں ڈھالا۔ یہی فطرت ان کی تخلیقات کا خمیر ہے کیونکہ جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ ان کی زندگی ان کی شاعری سے اور شاعری ان کی زندگی سے الگ نہیں ہے۔ یہاں یہ سوال اٹھانا قطعاً بے محل ہے کہ ان کی شاعری عمل سے بیگانہ کر دیتی اور زندگی سے فرار سکھاتی ہے۔ کیونکہ ہم فانی پر ایک شاعر کی حیثیت سے بحث کر رہے ہیں نہ کہ ایک مصلح کی حیثیت سے۔

اس مضمون کا مقصد یہ ہے کہ فانی اور غالب کی فکر کا ایک حد تک موازنہ کیا جائے۔ اس کے لیے ایسے اشعار کو منتخب کرنا زیادہ دلچسپی کا موجب ہوگا جن

میں فانی نے بالقصد غالب کے شعر کو سامنے رکھ کر اس سے ہٹ کر اپنے لیے جدا راہ نکالی ہے یا غالب کے خیال پر اضافہ و ترقی کی کوشش کی ہے۔

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار — اے کاش جانتا نہ تری رہ گذر کو میں
(غالب)

عشق و عاشقی کا عام مضمون ہے۔ جس میں عاشق نے رشک کے جذبے سے متاثر ہو کر تمنا کی ہے کہ کاش وہ معشوق کی گلی سے واقف ہی نہ ہوتا جس کی بدولت اس کی تلاش میں رقیب کے گھر جانا پڑا۔ اس موضوع پر مومن کا شعر ہے

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

ایک طرف محبوب کے نقش پا کے احترام میں یہ مبالغہ۔ دوسری طرف اپنی ذلت کے احساس کی یہ شدت اس کے برخلاف فانی کے شعر میں ایک عارفانہ اور دقیق مضمون پیش کیا گیا ہے۔

ہر نقش پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کو میں — پہچانتا نہیں ہوں تری رہ گذر کو میں

دراصل یہ وہ کیفیت ہے جو ہر سالک کو ابتدائے سلوک میں پیش آتی ہے۔ صوفیہ کہتے ہیں کہ روح اپنے مرکز اصلی سے چھوٹ کر اسی (مرکز اصلی) کی جستجو میں گرم سفر ہوتی ہے لیکن اثنائے راہ میں یہ دھوکا پیش آتا ہے کہ غلطی سے ہر عکس کو جلوہ سمجھ کر ٹھٹھک جاتی ہے۔ ع

ہر نقش پا کو دیکھ کے دھنتا ہوں سر کو میں

مرزا غالب کے یہاں رشک کے مضامین جس ندرت کے ساتھ ادا کیے گئے ہیں اس کی مثال کم شعرا کے یہاں ملتی ہے۔ رشک کا یہ مضمون بھی خوب ہے

چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں — ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں

غالب رشک کی وجہ سے محبوب کے گھر کا نام نہیں لیتے اور عالم اضطراب میں

ہر ایک سے پوچھتے ہیں کہ "جاؤں کدھر کو میں" لیکن فانی نے اسی مضمون کو زیادہ نزاکت سے پیش کیا ہے۔

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو

پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

راہ طلب میں حضرت خضر سے بھی پوچھنا گوارا نہیں۔ اس کے علاوہ فانی نے پائے شوق کو جہت آشنا نہ ہونے کا ذکر کر کے سرے سے اس کی گنجائش ہی نہیں رکھی کہ کسی سے راستہ دریافت کیا جائے۔

غالب۔ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہو یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

شعر کی خوبی یہ ہے کہ عاشق نے جس کی خاطر گھر لٹا دیا ہے وہی اس کو بے ننگ و نام ہونے کا طعنہ دے رہا ہے۔ ع

تم جو ہنستے ہو مرے حال پہ رونا ہے یہی

مگر یہاں گھر لٹانے کی وجہ بیان نہیں کی گئی ہے تاہم شعر اپنی جگہ لطف سے خالی نہیں۔ فانی دیوانگی کے عالم میں گھر کو آگ لگاتے ہیں اور اپنے زعم میں یہ سمجھتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ذرا دل بہل جائے گا اور ساتھ ہی تھوڑی دیر کے لیے سیاہ خانہ روشن ہو جائے گا۔ مگر افسوس ایسا نہیں ہوتا وہ بے ساختہ چیخ اٹھتے ہیں۔

بہلا نہ دل، نہ تیرگی شام غم گئی یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں

یہ مد نظر رہے کہ ذرا دیر کے لیے اجالا ہونے کے بعد جو اندھیرا چھا جاتا ہے وہ مزید وحشت کا سبب ہوتا ہے اور روشنی کے تضاد میں یہ تاریکی زیادہ بھیانک معلوم ہوتی ہے۔

غالب

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غالب نے بات وہی کہی ہے جو انیس انتہائی سادگی و بے تکلفی کے ساتھ کہہ گئے ہیں۔ ع

آنا ترا دلیل جانے کی ہے

یہ حقیقت ہے کہ غالب کا انداز فکر اور طرز بیان نہایت سنجیدہ اور خیال انگیز (THOUGHT PROVOKING) ہے مگر شعریت کی کمی ہے۔ غزل کا ہلکا پھلکا بن اس گرانی کا متحمل نہیں۔ فانی نے یہی مضمون زیادہ شاعرانہ انداز میں ادا کیا ہے

تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

غالب :-

جب تک کہ نہ دیکھا تھا قدِ یار کا عالم میں معتقدِ فتنۂ محشر نہ ہوا تھا

فانی :-

اک کفر سراپا نے کیا حشر کا قائل میں معتقدِ حشر مجسم نہ ہوا تھا

دونوں نے بظاہر ایک ہی بات کہی ہے اور دونوں نے محبوب کے فتنہ خرامی کا ذکر چھیڑ کر فکر مری حقیقت سے غیر مری حقیقت تک لے جانے کی کوشش کی ہے لیکن یہاں بھی فانی کے خیال میں ترقی نظر آتی ہے۔ غالب قدِ یار کو دیکھ کر فتنۂ محشر کے قائل ہو جاتے ہیں جو قدِ یار کی مثل یا اس سے فتنہ خیزی میں بڑھا ہوا ہے جیسا کہ سیاق عبارت سے ظاہر ہوتا ہے۔ فانی معشوق کو حشر سے بڑھ کر فتنہ خیز قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ حشر، تو صرف حشر ہے اور محبوب،

حشر مجسم ہے . . . . . . ۔ جب حشر مجسم کا وجود آنکھ سے دیکھ لیا تو محض حشر کا وجود پہلے ثابت ہو جاتا ہے۔ فانی کا شعر منطقی حیثیت سے زیادہ مستحکم ہے، اگرچہ شعر میں ادعائے محض ہے۔ تاہم غزل کی شاعری میں ادعا کے بغیر کام نہیں چلتا فانی کے یہاں "کفر سراپا" کا ٹکڑا معنی خیز ہونے کے ساتھ نہایت بے ساختہ ہے جو ان کی قدرت زبان کی دلیل ہے لطف یہ ہے کہ حشر کا اعتقاد ایمان کی علامت ہے۔ مگر یہاں اک "کفر سراپا" ایمان کا سبب بن گیا۔

غالب:۔ ہے تو آموز فنا ہمت دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

فانی:۔ ہائے وہ وعدۂ فردا کی مدد شوق اخیر — ہائے وہ مطلب دشوار کہ آساں نکلا

غالب فطرتاً مشکل پسند واقع ہوئے ہیں جس کا اقتضا یہ ہے کہ فنا یا ہستی کو مٹانے کی مشق (جو دوسروں کے لیے نہایت دشوار ہے ان کو ابتدا ہی میں آسان معلوم ہوتی ہے اور اس بنا پر ان کی فطرت شکوہ سنج ہے۔ فانی کے شعر میں صوفیانہ نہیں بلکہ عاشقانہ مضمون ہے مگر نہایت پہلودار اور پر لطف معشوق کو وعدہ فردا کرنا دشوار معلوم ہوتا تھا۔ یہاں تک عاشق کا آخر وقت آگیا۔ اب اس ظالم نے جانے کیا جاتی ہوئی دنیا دیکھ لی کہ وعدہ فردا کر لیا نتیجہ یہ ہوا کہ اس وعدہ فردا کے بھروسے پر عاشق نے (خوشی کے مارے) جان دے دی۔ اس طرح وہ وعدہ فردا جو محبوب کو دشوار معلوم ہوتا تھا بہت آسان نکلا۔ محبوب کیلئے یوں آسان نکلا کہ اس کو ایفا کے جھنجھٹ سے نجات ملی اور عاشق کے حق میں یوں کہ اس کی بدولت نزع کی مشکل سہل ہو گئی۔

جہاں غالب اور فانی نے تصوف کے میدان میں قدم رکھا ہے وہاں دونوں کی فکر کا فرق اور زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

غالب:۔ محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

فانی:۔ اٹھتی نہیں ہے تہمت نظارۂ جمال — منہ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا

دونوں باکمالوں نے دو مختلف حقیقتیں بیان کی ہیں۔ غالب کی مراد یہ ہے کہ جس کو دنیا والے حجاب کہتے ہیں وہ دراصل پردہ ساز ہے جس سے نغمہائے راز نکل رہے ہیں۔ یعنی اہل معرفت کے حق میں ہر چیز اسی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ فانی کہنا چاہتے ہیں کہ منظور سے الگ ناظر کی ہستی ہی کہاں ہے جو نظارہ جمال کی تہمت برداشت کی جاسکے۔ اس لیے لامحالہ تہمت سنتا ہوں اور حیران ہو کر جلوۂ نظارہ ساز کا منہ دیکھنے لگتا ہوں، انسان جب کسی کی زبان سے ایسی تہمت اپنے متعلق سنتا ہے جو بعید ہو تو حیران ہو کر تہمت لگانے والے کا منہ دیکھنے لگتا ہے۔ منہ دیکھنا، کا استعمال کس قدر برمحل ہے اور جلوۂ نظارہ ساز کی ترکیب بھی فانی کا حصہ ہے۔

غالب:۔ اسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا — جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دوچار ہوتا

فانی:۔ تعینات کی حد سے گزر رہی ہے نگاہ — بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

غالب کا شعر سادہ ہے ان کے برخلاف فانی نے ع

بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

کہہ کر شعر میں جو حسن اور زور پیدا کر دیا ہے وہ اردو تو درکنار فارسی میں بھی مشکل سے ملے گا۔

غالب:۔ ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر — یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

فانی :۔ اللہ ری چشم ہوش کی کثرت پرستیاں ذرے ہی رہ گئے کوئی صحرا نہیں رہا

غالب کا مقصد یہ ہے کہ قطرہ و موج و حباب کوئی الگ ہستی نہیں رکھتے۔ یہ وجود بحر ہی کا دوسرا نام ہے۔ اس جگہ بھی فانی کا انداز زیادہ دلکش اور شگفتہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کو اہل ظاہر کی "چشم ہوش" سے شکایت ہے کہ وہ کثرت پرستی میں مبتلا ہے اور اس کو ذرے ہی ذرے نظر آتے ہیں صحرا دکھائی نہیں دیتا وحدت الوجود فانی کا خاص مضمون ہے جس کے اظہار کے لیے انھوں نے نئے پیرائے اختیار کیے ہیں۔

غالب :۔ جب وہ جمال دل فروز صورت مہر نیم روز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منھ چھپائے کیوں

فانی :۔ کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

غالب :۔ دہر جز جلوۂ یکتائی معشوق نہیں ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا خود بیں

فانی :۔ عرض ناز ماز ہے کثرت مجاز کا آئینے سے لگ گئے پرتو جمال میں

غالب :۔ ہے غیب غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

فانی :۔ ہر جلوۂ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب ہیں ہیں
نظارہ نظر میں شامل ہے نظارے میں شامل کوئی نہیں

غالب :۔ گردش ساغر صد جلوۂ رنگیں تجھ سے آئینہ داری یک دیدۂ حیراں مجھ سے

فانی :۔ حیرت نے مجھے تیرا آئینہ بنایا ہے اب تو مجھے دیکھا کرے اے جلوہ جانانہ

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسے ہی اشعار فانی کے آیات کمال میں شمار ہونے کے قابل ہیں۔ اور انھیں کی بدولت ان کو ہماری زبان کے غزل نگاروں میں ایک بلند مقام حاصل ہے۔

غالب: دشنۂ غمزہ جانستاں ناوکِ ناز بے پناہ
تیرا ہی عکسِ رخ سہی سامنے تیرے آئے کیوں

فانی: خود تجلی کو نہیں اذنِ حضوری فانی — آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے
غالب: دل ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر — ہم اس کے ہیں، ہمارا پوچھنا کیا
فانی: تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا — ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا
غالب: تھک تھک کے ہر مقام پہ دو چار رہ گئے — تیرا نشاں نہ پائیں تو ناچار کیا کریں
فانی: نشانِ مہر ہے ہر ذرہ ظرفِ مہر نہیں — خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

اب ہم یہاں فانی کے چند ایسے خیالات نقل کرنا چاہتے ہیں جن سے غالب کا کلام خالی ہے۔ اور جن پر ذوالکرم کی انفرادیت کا بجا طور پر دارومدار ہے لیکن ہے کہ بعض طبائع فانی کی دقت پسندی اور موشگافی پر چیں بہ جبیں ہوں اور ان کے افکار کو عظمت کے منافی قرار دیں لیکن ہمارے نزدیک یہ افکار ہی ان کی عظمت کی روشن دلیل ہیں۔ ایک روایتی شاعر کے یہاں ان خیالات کی جھلک بھی ملنا مشکل ہے۔ جب تک کوئی شخص اپنی خودی میں ڈوب کر نہ ابھرے ذیل کی مثالوں سے ہمارے بیان کی بخوبی تصدیق ہو سکتی ہے۔

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی — وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا
کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا — یہ راز ہے کہ کوئی رازداں نہیں ملتا
میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا — اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا
سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہِ محبت میں قدم میرا

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

مفہوم کائنات تمھارے سوا نہیں — تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا
رازِ دل سے نہیں واقف دلِ ناداں میرا — تیرے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا
حسن ہے ذات میری، عشق صفت ہے میری — ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا
حاصلِ علم بشر جہل کا عرفاں ہونا — عمر بھر عقل سے سیکھا کیے ناداں ہونا
اک عالم دل ہے یہی دنیا یہی فردوس — ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی
یارب نوائے دل سے تو کچھ آشنا سے ہیں — آواز آرہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی
تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر — نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے
کس کو کہیے ماسوا جب تو نہیں تو کچھ نہیں — تو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا بھے
صحرا کا اجتہاد ہے ذرے کی ہر نمود — ذرے کا اعتبار ہے صحرا کہیں جسے
پڑتا نہیں اس آئینے میں عکس کوئی اور — دل میں تری تصویر سی رکھدی ہے کسی نے

مثالیں کہاں تک پیش کی جائیں۔ تمام دیوان مثالوں سے بھرا ہوا ہے حقیقت یہ ہے کہ ایسے دس پانچ اشعار بھی اگر کسی سے بن پڑیں تو اس کی شاعرانہ عظمت ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں۔ غالب کی عظمت سے انکار نہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ذہنی طور پر فانی نے غالب سے بہت کچھ استفادہ کیا ہوگا غالباً اسی لیے کہا جاتا ہے کہ دورِ جدید میں غالب نے دو روپ اختیار کیے ایک نے اصغر کی صورت اختیار کی اور دوسرے نے فانی کی۔ مگر میں کہنا چاہتا ہوں کہ فانی کی شاعری کو غالب کی صدائے بازگشت ہرگز نہیں کہا جا سکتا چراغ سے چراغ جلانے کی بات دوسری ہے ورنہ فانی نے غالب کے اثر سے آزاد ہو کر جہاں کسی خیال کو بھی پیش کیا ہے تو اس میں اس طرح اضافہ کر دیا کہ وہ فانی کا اپنا حصہ بن گیا۔ متاخرین شعرائے ایران و ہند میں بیدل کو

چھوڑ کر دوسرے شعرائے فارسی کے یہاں یہ نزاکت خیال مشکل سے ملے گی ہم نے یہاں موازنہ کرتے وقت فانی کے اس کلام کو قصداً پیش نہیں کیا جس میں انھوں نے اپنے محبوب موضوعات (غم۔ جبر و قدر۔ گناہ و عفو) پر قلم اٹھایا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ معاصرت حقیقت تک پہونچنے میں بڑی رکاوٹ ہوتی ہے اور یہ واقعہ بھی ہے کہ اگر ہم کسی چیز کو بالکل آنکھ سے ملا کر دیکھیں تو کسی صحیح نتیجے پر مشکل سے پہونچ سکیں گے۔ فانی کے معاملہ میں بھی یہی معاصرت سنگ راہ ہوئی ہے۔ کسی نے ان کو سوز خواں اور ہر وقت بسورنے والا ٹھہرایا کسی نے ان کی شاعری کو بے کیف اور یک رنگی کا حامل بنایا۔ دراصل بات یہ ہے۔

چوں ندیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

بعض اصحاب نے فانی کے اشعار میں کچھ فنی خامیاں ڈھونڈھ نکالیں اور خیال کیا کہ تنقید کا حق ادا کر دیا۔ سچ یہ ہے کہ یہ سب تصویر کے یک طرفہ ادھورے رخ ہیں۔ ضرورت ہے کہ اس باکمال شاعر کی حیات واردات اور معتقدات کے پس منظر میں اس کے اذکار کا تجزیہ کیا جائے اور اس کے فن کا جائزہ لیا جائے جس سے اس کی تخلیقات کی نسبت ایک معتدل اور منصفانہ نظریہ قائم ہو سکے۔

فانی اور معترضین

میتھو آرنلڈ کہتا ہے، تنقید اس بات کی بے غرض کوشش ہے کہ دنیا کی بہترین معلومات اور افکار سے واقفیت بہم پہونچے۔ ان کی اشاعت کی جائے تاکہ ہماری قوت متخیلہ اور تخلیقی صلاحیت کو سہارا ملے۔ جب ہماری نظر قدیم ناقدین پر پڑتی ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے نزدیک صرف زبان و بیان کی صفائی ہی ادب و شعر کی روح ہیں۔ ان کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ شاعر یا ناشر کا مرکزی خیال کس چیز کا مطالبہ کر رہا ہے۔ وہ اس کی روح تک پہونچنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔ جدید نقاد اس کے برعکس نظر آتے ہیں۔ وہ شاعر یا ناشر کی روح تک پہنچنے کی کوشش میں زبان و انداز بیان کو یکسر فراموش کر دیتے ہیں۔ ان کو اس سے مطلق واسطہ نہیں کہ ادب میں جتنا مرکزی خیال کا حصہ ہے اسی قدر شعر کے سبھاؤ اور زبان کو بھی دخل ہے۔ اسی بے راہ روی کا اثر ہے کہ قدیم ناقدین کے نزدیک جان صاحب رنگین کی شاعری بھی ہماری زبان کا شاہکار اور جدید ترین کے خیال میں میراجی اور راشد کی شاعری بھی ادب کا بیش بہا خزانہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اکثر ناقدین ترقی پسندی کی آڑ لے کر ہر لغویت کو شاہکار ادب نہ صرف خود مانتے ہیں بلکہ مصر ہوتے ہیں کہ دوسرے بھی ان کے خیالات کی حمایت کریں۔ حالانکہ یہ امر بدیہی ہے کہ ایک نقاد کا کام نہ صرف تقریظ ہے اور نہ تعریض۔ اس کا فرض اول کلام کا تجزیہ (ANALYSIS) کرنا اور پھر فیصلہ

صادر کرنا ہے اور ظاہر ہے کہ بغیر تجزیہ کے کسی قسم کا حکم صادر نہیں کیا جا سکتا مگر اکثر نقاد ادب میں من مانی کرتے ہیں اور پھر اپنے نکالے ہوئے نتیجوں کو صحیح سمجھ کر ان کی تبلیغ کرتے ہیں۔ والٹر پیٹر تو اس کے بھی مخالف ہے کہ نقاد خود کوئی فیصلہ دے۔ اس کا خیال ہے کہ "پہلے شاعر کے محاسن کو محسوس کرنا اور پھر اس کی تشریح و توضیح کرنا اور آخر میں فیصلہ لوگوں پر چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ خود نتائج استنباط کریں۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جب کوئی نقاد کسی تعصب (خواہ وسماجی ہو یا مذہبی انفرادی ہو یا اجتماعی) کی بنا پر کسی کے کلام کا جائزہ لیتا ہے تو وہ منصب نقد سے گر جاتا ہے۔ نقاد کا فرض ہے کہ شاعر یا ادیب کے محاسن و عیوب پر غیر جانبدارانہ نظر ڈالے۔ محاسن کی تفصیل و تشریح کی طرف لوگوں کو متوجہ کرے اس کے عیوب کو ہمدردانہ جذبے کے ساتھ اس طرح دکھائے جیسے کوئی خیر خواہ اس کو بلند و بالا اوصاف سے متصف دیکھنا چاہتا ہے۔ بے عیب ذات اللہ کی شاعر ہو یا ناشر نقاد ہو یا معترض۔ ہر ایک میں کچھ خوبیوں کے ساتھ خامیوں کا ہونا لازمی امر ہے۔ مگر بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارے ناقدین یہ امر بالکل فراموش کر دیتے ہیں۔ فانی نے خود ایک جگہ فن نقد کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

"دنیا شاعری کے حقیقی مفہوم سے آج نہیں بلکہ کبھی آشنا نہیں ہوئی۔ جب کوئی حقیقی شاعر دنیا کے سامنے آیا۔ دنیا نے اس کو کبھی نہیں پہچانا۔ اس کی زندگی میں اس کے ساتھ دو طرح کا سلوک ہوا بعض نے اسے آدمی تو سمجھا مگر ذلیل و حقیر۔ اس

لیے کہ اس کا وجود دنیاوی اعتبار اور افادی نقطہ نظر سے بے کار محض تھا۔ بعض حضرات نے اس کی بلندیٔ تخیل اور پرواز خیال کی اپنے نزدیک بہت کچھ قدر فرمائی اسے آدمی سے بالاتر سمجھا[1]۔

فانی ان بدقسمت لوگوں میں تھے کہ ان کو ہمیشہ مورد تنقید بننا پڑا۔ ان کو کوئی حالی جیسا نقاد نہ ملا جو صحیح طور پر تنقید کا حق ادا کرتا نہ بجنوری جیسا تقریظ نگار ملا جو ان کے کمالات کو اجاگر کرتا۔ اس سے زیادہ اور کیا بدنصیبی ہوگی کہ فانی کے دوستوں نے بھی ان کو اچھے الفاظ سے یاد نہ کیا۔ فانی پر اعتراض کرنے والوں میں بیشتر وہ اصحاب ہیں جو ادب برائے زندگی کا نعرہ بلند کرتے ہیں یا وہ لوگ ہیں جو قریب ہونے کے باوجود فانی سے دور ہیں وہ ان کے کلام کو صرف یاسیات کا مرقع اور نوجوانوں کے مستقبل کے واسطے زہر قاتل خیال کرتے ہیں۔ فانی پر اعتراض کرنے والوں میں جوش ملیح آبادی۔ سیماب اکبرآبادی۔ عندلیب شادانی سید حامد، صبیح احمد کمالی اور مس تاج بیگم قابل ذکر ہیں۔

عام طور سے فانی کی شاعری پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ ان کے یہاں ادب برائے زندگی کا تصور نہیں ہے۔ وہ زندگی کی اس تنہا راہ پر گامزن ہیں جہاں ہر چیز ان کو تصویر افسردگی نظر آتی ہے۔ ان کا درد یاس نہ صرف شاعری بلکہ زندگی کے لیے سخت مہلک ہے۔ ان کے یہاں افراط زیادہ عرفان کم ہے[2]۔

---

[1] شعر و شاعری از فانی۔ سب رس۔ حیدرآباد۔

[2] دوسرا رخ از سید حامد (علی گڑھ میگزین۔ فانی نمبر)

ادب برائے ادب ہو یا برائے زندگی۔ جس میں حقیقت اور واقعیت نہ ہو ادب نہ، زندگی سے ہم آہنگ ہے اور نہ اس کے تقاضوں کو اجاگر کر سکتا ہے ہمارے شعرا پر عام طور سے یہی اعتراض وارد ہوتا ہے کہ ان کی زندگی عیش و عشرت میں گزرتی ہے مگر وہ غم فراق کی داستانیں بیان کرتے ہیں۔ سیاسی لیڈر ہی کے ساتھ نہیں بلکہ شاعر کے ساتھ بھی یہ حقیقت کارفرما نظر آئے گی کہ ع

قوم کے غم میں ڈنر کھاتے ہیں حکام کے ساتھ

ان سب سے قطع نظر ادب برائے زندگی کا نظریہ بہت خوب ہے مگر سوال یہ ہے کہ خود زندگی کیا ہے؟ اس کے مطالبات کیا ہیں؟ کوئی زندگی کو شادمانی اور مسرت سے تعبیر کرتا ہے اور کوئی آرزو مندی و سرمستی سے۔ چنانچہ وہ لوگ جو زندگی کو سرمستی سے تعبیر کرتے ہیں ان میں اصغر کا نام خاص طور سے آتا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

شعر میں رنگینیٔ جوش تخیل چاہیئے مجھ کو اصغر کم ہے عادت نالہ و فریاد کی

وہ شاعری کا حاصل رنگینیٔ جوش تخیل کو خیال کرتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ معترف ہیں کہ دل درد آشنا نہیں ہے وہ درد کی ان لذتوں سے واقف نہیں جو سوز و گداز والوں کے حصہ میں آتی ہے۔ فانی شاعری کے ذریعہ سیاسی لیڈر مبلغ اور مذہبی پیشوا بننا نہیں چاہتے۔ ان کا نظریہ یہ ہے۔

"شعر کا حاصل خود شعر ہے اور بس۔ شعر کا تعلق کسی ملک کسی قوم یا کسی خاص شعبۂ زندگی تک محدود نہیں رہ سکتا۔ وہ بنی نوع انسان بلکہ تمام عالم موجودات کے وجود اور اس کی غیر محدود

کشاکش حیات سے تعلق رکھتا ہے[۱]۔

اپنے اسی نظریہ کی دوسری جگہ وضاحت کرتے ہیں۔

"شاعری کو کسی غیر شاعرانہ مقصد کے حصول کے لیے آلۂ کار نہیں بنایا جاسکتا خواہ وہ مقصد کچھ ہی کیوں نہ ہو مقصد کی بلندی یا اہمیت سے اس اصول میں کوئی فرق نہیں آسکتا[۲]"

بہر نوع اصغر کے یہاں خوشی و شادمانی ہے۔ فانی کے یہاں غم پسندی و دردمندی یہ اپنا اپنا ذوق اور اپنی اپنی نظر ہے۔ سرمستی و شادمانی کے سلسلہ میں ریاض کا نام خاص طور سے آتا ہے اگر وہ درست ہے تو پھر اگر دوسرا حزن و ملال رنج و آلام کا نام زندگی رکھتا ہے تو کیوں قابل الزام ہو۔ زندگی صرف وعظ کی محفلوں اور رقص و سرود کی سبھاؤں کا ہی نام نہیں ہے۔ انسانی زندگی کی حقیقتوں میں صرف شادمانی ہی تو نہیں ہے۔ کرب و مصائب کا بھی زندگی میں ایک مقام بلکہ خاص مقام ہے ؏

ہے الم کا سورہ بھی جزو کتاب زندگی

پھر اگر بہ نظر غور دیکھیں تو خود ادب بھی زندگی کے فرائض کی انجام دہی میں نمایاں نظر آئے گا آرٹ زندگی کا ایک ناگزیر پہلو ہے زندگی حقیقت میں اس وقت مکمل ہوتی ہے جب اس میں آرٹ کا تصور بھی شامل ہو۔ شاعر سے یہ مطالبہ کرنا کہ اس نے اپنی فطرت کے خلاف وہ چیزیں کیوں نہ اختیار کیں جو دنیا والے پسند کرتے تھے ایک مضحکہ خیز

---

[۱] و [۲]۔ شعر و شاعری از فانی (سبا دکن۔ حیدرآباد۔ جنوری ۱۹۶۱ء)

مطالبہ ہوگا۔

زندگی کے تقاضوں میں ایک یہ بھی ہے کہ انسان میں جمالیاتی حس ہو۔ جمالیاتی حس ہی دراصل وہ مذاق ہے جو انسان کے وجدانِ شعری کا پتہ دیتا ہے۔ جمالیاتی حس سے مراد عورت یا جنسی بھوک نہیں ہے بلکہ اس کا مقصد زندگی کے مختلف پہلوؤں کو دلکش طریقہ سے اجاگر کرنا ہے۔ ایک مصور کا یہی فرض نہیں ہے کہ وہ دلکش گلشنوں اور خوشنما روشوں کی تصویریں کھینچ کر ہمارے دل کو لبھائے بلکہ اس کا فرض یہ بھی ہے کہ باغ کے ان گوشوں کو بھی عریاں کرے جو باغباں کے تغافل کے شکوہ سنج ہیں۔ اس کا کام صرف پھولوں ہی کی مصوری کرنا نہیں ہے بلکہ کانٹوں کو بھی ان کا مقام دینا ہے۔ یہی فرائض شاعر کے بھی ہیں کہ وہ صرف زندگی کے حسین پہلوؤں ہی کو نمایاں نہیں کرتا بلکہ اس کے مکروہ اور بھیانک گوشوں کو بھی بے نقاب کرتا ہے۔ بقول نیاز فتح پوری :-

"نقاش ہو یا بت تراش، شاعر ہو یا ادیب، اس کی تمام فنکاریاں اس کی ذات کے لیے نہیں دوسروں کے لیے ہیں اس لیے اگر اس کی زندگی اور اس کا فن دنیا کے حقائق کو اہل دنیا کے لیے گوارا نہ بنا سکا تو یہ تصور حقیقت کا نہ ہوگا بلکہ فن کار کا جو حقیقت کو موزوں لب و لہجہ اور مناسب زبان میں پیش نہ کر سکا۔"[1]

جمالیاتی ذوق کا تعلق براہ راست زندگی سے ہے اور زندگی کے لیے

---

[1] انتقادیات۔ حصہ دوم از نیاز فتح پوری۔

اخلاقی اقدار کا ہونا بھی لازمی ہے۔ ممکن ہے کہ نٹشو اور عصمت کے افسانے راشد اور میراجی کی نظمیں آرٹ کے نمونے ہوں مگر صحیح زندگی کے حامل نہیں کہے جا سکتے اس لیے کہ وہ زندگی کے اس مطالبے کو پورا نہیں کرتے جو اخلاق سے متعلق ہو۔ یہی وہ موقع ہے جب آرٹ ابلاغ کے فرائض کی ادائگی میں کوتاہی کرتا ہے اور زندگی کی عدالت میں مجرم ٹھہرتا ہے۔

بات کہاں سے کہاں جا پہنچی۔ ذکر فانی کا ہو رہا تھا۔ ان کے یہاں زندگی ہے اور زندگی کو گذارنے کا سلیقہ بھی۔ ان کی زندگی آلام و حرماں کی زندگی ہے مگر بے کیف نہیں ہے جہاں وہ زندگی کے تلخ حقائق کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے تیور دیکھئے۔

ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی ایمان زندگی پہ ذرا آزما کے دیکھ
ٹوٹا طلسم ہستیٔ فانی کے ناز کا احسان مند ہوں الم جاں گداز کا

اعتراض کے اسی سلسلہ کی دوسری کڑی یہ ہے کہ ان کا درد نوجوانوں کے بڑھتے ہوئے غم اور ولولوں کے لیے زہر قاتل ہے۔ اگر اس کا ماحصل یہ ہے کہ درد و الم ہی فانی زندگی کے لیے مضر ہے تو اس پر ہم اپنے شروع کے ابواب میں کافی روشنی ڈال آئے ہیں اور اگر اس میں خصوصیت کے ساتھ فانی کے درد و الم اور ان کی قنوطیت کی جانب روئے سخن ہے تب بھی یہ دعوا بے دلیل ہے فانی کی زندگی اور شاعری کا شروع سے مطالعہ کر جائیے وہاں وہ پیکر حرماں و یاس ضرور نظر آتے ہیں مگر ان کی یاسیت نے شعر و ادب یا زندگی کو نقصان نہیں پہنچایا انھوں نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا اور اس کی

حقیقت کو پہچانا تھا۔ انھوں نے لوگوں کو نشاط و شادمانی کے حسین سراب کے فریب میں مبتلا نہیں رکھا جہاں آنسوؤں کو بھی قہقہوں میں اڑا دیا جاتا ہے۔ وہ دنیا کے بازار سے گذرنے کے گنہ گار ضرور تھے مگر اس کے خریدار کبھی نہیں بنے وہ صرف حقیقت پسند شاعر تھے۔

شعبدے آنکھوں کے ہم نے کتنے ایسے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی، بند ہوئی افسانہ تھا

سرور صاحب کا خیال ہے۔

"فانی کے یہاں غم ہے اور غم کا عرفان بھی۔ وہ فلسفی نہیں لیکن استدلال اور طرز بیان فلسفیانہ ہے۔ وہ واردات انسانی کے کامیاب مصور ہیں اور قدیم رنگ کے برتنے والوں میں فانی کا لب و لہجہ سب سے زیادہ آفاقی ہے۔"

اہل سخن سے یہ امر پوشیدہ نہیں کہ فانی کے یہاں نہ تو وہ مرثیت ہے جو لکھنؤ کی غزل کا طغرائے امتیاز ہے اور نہ وہ ہمت شکن تعلیم ہے جو ہارڈی شوپنہاور کے یہاں ملتی ہے۔ بقول فراق:

"ایسے اشعار کو جنازے بازی یا مرگھٹ کا رونا کہنا تنقید نہیں ہے۔ جھلاہٹ ہے ایسی جھلاہٹ جس پر خود فانی بھی مسکرا دیتے ہیں۔ شاعر عذاب زندگی و گناہ کا کفارہ ادا کرتا ہے۔ وہ دنیا کی نجات کے لیے صلیب یا پھانسی پر چڑھتا ہے۔ وہ اپنے آنسوؤں سے دھو کر زندگی کی گرد آلود فضا کو صاف

لہ فانی بدایونی۔ پروفیسر الطاف احمد سرور۔ تنقیدی اشارے

لوگ اسی احساس سے دوچار ہوتے تھے جو ایک دورافتادہ بچے کو آغوش مادر میں واپس آنے پر ہو سکتا ہے۔ خاک وطن سے وابستگی کا یہ احساس ان لوگوں کو بھی رہتا تھا جن کے تاثرات وطن اور اہل وطن کے بارے میں زیادہ خوشگوار بھی نہ رہے ہوں۔ فانی نے اپنی ایک رباعی میں اسی احساس کی بڑی خوبصورتی کے ساتھ ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

گو خار ہوں جب یاد چمن آتی ہے انگاروں پہ لوٹتے ہی بن آتی ہے
کافر ہوں جو جنت میں بھی چین آتا ہو دوزخ سے بھی جب بوئے وطن آتی ہے

جہاں تک علمی اور تہذیبی زندگی کا تعلق ہے یہ ماننا پڑے گا کہ بدایوں کی خنگاگوں فضا مذہبی، علمی اور ادبی روایات کے تسلسل کو برقرار رکھنے میں بہت معاون ثابت ہوئی۔ خاندانوں کی مسلسل روایات کی بدولت یہاں نام و نسب کے امتیازات نے غیر معمولی اہمیت حاصل کر لی تھی۔ روایات سے انحراف کی مثالیں تو ہر جگہ ملتی ہیں لیکن ہندوستان میں ایسی بستیاں کم نظر آئیں گی جہاں روایات اتنی سخت جان اور مستحکم رہی ہوں کہ کبھی کبھی تو ان پر چٹانوں کی سی سختی کا گمان ہونے لگتا ہے۔ اسی روایت پرستی نے بدایوں کی مذہبی روایات میں تغلب پیدا کیا اور یہی رجحان علوم متداولہ کے بارے میں قائم رہا۔

بدایوں متوسط الحال تعلیم یافتہ مسلمان گھرانوں میں علوم مشرقی (فارسی، عربی زبان و ادب) سے وابستگی بہت گہری تھی۔ چند بڑے مدرسوں کے علاوہ جن میں فارسی و عربی اور دینیات کی باضابطہ تعلیم دی جاتی تھی۔ ہر محلے میں مکتب اور مدرسے موجود تھے۔ ایسے لوگ بھی جو کسی مجبوری کی بنا پر علوم رسمی کی تکمیل نہ کر سکے تھے زبان و ادب (خصوصاً فارسی اور اردو) میں اتنا درک رکھتے تھے کہ کوئی ناواقف شخص ان کے مبلغ علمی کے بارے میں صحیح اندازہ نہ لگا سکتا

کر دیتا ہے[1]۔"

فانی کا درد حکیمانہ ہے اور اس میں عرفانیات کا جز و شامل ہے۔ اس نے غم کو مسرت، بربادی کو آبادی اور موت کو زیست بنا دیا۔ وہ جب غم کو مسرت خیال کرتے ہیں تو پھر غم غم ہی کب رہا۔

غم فانی و عیش بر ہم کیا — جاوداں ہو تو عیش ہے غم کیا
غم کو جو خوشی بنا کے چھوڑے — فانی وہ نصیب چاہتا ہوں

فلسفہ کی قدروں اور ایمان کے شعور نے فانی کے غم کا یکسر ڈھانچا ہی بدل دیا ظاہر ہے ایسی حالت میں غم کو "سوز خوانی" سے کوئی تعلق ہی نہیں رہتا۔ ذرا اس قنوطی شاعر کے چند اشعار سنیئے۔

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاج دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا
بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار — سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو

اس قسم کے بکثرت اشعار فانی کے کلام میں مل جائیں گے۔ اس کے بعد یہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا کہ ان کا وجود انسانی زندگی کے لیے زہر کے مترادف تھا دراصل وہ افراد جو، زندگی کی پستیوں اور اس کی فروما یہ لذتوں میں مگن ہیں، فانی کے غم کی رفعتوں کا اندازہ ہی نہیں کر سکتے۔ فانی نے غم کی حقیقت کو سمجھا۔ اس کی تلمیح کو خوش گوار بنایا اور نوجوانوں کو غم (جس کے وجود کا انکار حقیقت کا انکار ہے) کے

---

[1] فانی بدایونی۔ فراق گورکھپوری۔ علی گڈھ میگزین نمبر

سہارے کا حوصلہ دیا۔

فانی پر ایک اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ غم کی پرورش اور اس کی نمائش کرتے ہیں۔ ان کی شاعری نے ہمیں کچھ نہیں دیا۔ معترض عظیم بیگ کی مثال دیتے ہیں کہ مصیبت ان پر آئی مگر ان کی ہنسی میں تلخی نہیں پیدا ہوئی[1]۔

مگر معترض اعتراض کرتے وقت اس حقیقت کو فراموش کر جاتے ہیں کہ ہر شاعری اور ہر آرٹ نمائش کا نام ہے۔ اگر انسانی دل و دماغ میں نمائش کا جذبہ نہ ہوتا تو آرٹ کا وجود ہی نہ ہوتا۔ ساز سے نکلی ہوئی آواز سب کچھ بن جاتی مگر نغمہ نہ بنتی دل کا درد فضا کے لامتناہی فاصلوں میں گم ہو جاتا مگر اس میں تڑپ نہ پیدا ہوتی ایک مصور جب کوئی اپنا شاہکار بناتا ہے تو کبھی اس کو پردوں کے پیچھے چھپا کر نہیں رکھتا وہ اس کا متمنی ہوتا ہے کہ لوگ اس شاہکار کو دیکھیں اور اس کے کمال کی داد دیں تصویر بناتے وقت اس کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے کہ اس حسین تصور کو جو اس کے دل و دماغ میں پرورش پا رہا ہے تصویر کی شکل میں اتار دے جب وہ اپنے اس مقصد میں کامیاب ہو جاتا ہے تو خواہش مند ہوتا ہے کہ تصویر سے مصور کی وابستگی کا نفسیاتی لمحہ جو اس کو حاصل ہے دوسروں تک منتقل کر دے۔ دوسرے الفاظ میں اس کو کسی سے اپنے فن کی داد ملے۔ اگرچہ اکثر و بیشتر شوق میں وہ خود اپنے کو داد دے لیتا ہے۔ ع

میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

تاہم دوسروں کو اپنے جذبات میں شریک کرنے کی آرزو ایک نیچرل تقاضا اور

---

[1] دوسرا رخ از سید حامد۔ علی گڑھ میگزین۔ فانی نمبر

انسانی فطرت کا ایک نفسیاتی پہلو ہے۔ یہی حال ایک شاعر کا ہے۔ وہ خون جگر سے سینچ کر زمین شعر کی آبیاری کرتا ہے وہ اپنے خیالات کو شعر کا جامہ پہناتا ہے اس کی تمنا ہوتی ہے کہ اس کے زخم جگر کی اس کو داد ملے۔ فانی بھی ایک انسان تھا وہ ایک ایسی دنیا کا بسنے والا تھا جہاں انسانی فطرت کے تقاضوں سے مفر نہیں ہے اس کے یہاں درد والم اس لیے نہیں ہے کہ لوگ اس سے ہمدردی کریں نہ کسی سے ہمدردی کا طلب گار رہتا ہے اور اس کی عزت نفس اس ننگ کو گوارا نہیں کرتی ؎

آ کے تماشا گاہ جہاں میں داد تماشا کیا چاہوں

پھر بھی وہ نفس نمائش کے مخالف نہیں۔ نمائش صرف وہ بری ہے جس میں بناوٹ ہو جس میں حقیقت کی پردہ پوشی کی جائے اور جس میں جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہو۔ مگر وہ نمائش جس میں حقیقت کی جلوہ نمائی، صداقت کی کارفرمائی ہو۔ جلوہ سراب کو سراب ہی بتایا جائے، چشمہ آب کا لیبل نہ لگایا جائے اس کو بے کار یا مضر کہنا دانائی نہیں، ان کے یہ اشعار دیکھئے جو صداقت اور حقیقت کی واضح مثال ہیں۔

مذاق تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا — بغیر مرگ جسے زیست کا مزا نہ ملا
دلی زباں سے مرا حال چارہ ساز نہ کہہ — بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا
تلاش خضر میں ہوں روشناس خضر نہیں — مجھے یہ دل سے گلا ہے کہ رہنما نہ ملا

وہ فریاد نہیں کرتے بلکہ ایک حقیقت پسند کی طرح زندگی کے چہرے سے پردہ ہٹاتے اور اس کا اصلی رخ دکھاتے ہیں۔ علاوہ بریں اگر نمائش کا اظہار مذموم ہے تو طرب و نشاط۔ رندی اور سرمستی کی نمائش پر اعتراض کیوں نہیں وارد ہوتا۔ پھر لطف یہ کہ

غم کے مقابلے میں خوشی و نشاط کی نمائش زیادہ سطحی اور عارضی ہوتی ہے
خوشی کی نمائش انسان کو سبک بنا دیتی ہے غم سے آنکھیں چار کرکے اس کو دعوت
دینا عام انسانوں کی سطح سے زیادہ بلند انسانوں کا کام ہے۔ جو صرف ایذا ہی سے
نہیں بلکہ لذتِ ایذا سے بھی آشنا ہوتا ہے۔ وہ دنیا کے قہقہوں کا کفارہ اپنے
آنسوؤں سے ادا کرتا ہے اس کے یہاں کلبۂ احزاں، لذت غم، تیرگی شام غم
اور منزل فنا کا نشان شکستہ، نمائشی نہیں ہیں بلکہ زندگی کے ٹھوس حقائق ہیں
جن کو شعریت نے اجاگر کر دیا ہے۔ جن حضرات نے فانی کی زندگی اور ان کی شاعری
کا غائر مطالعہ کیا ہے وہ واقف ہیں کہ فانی نمائش سے کوسوں دور تھے۔

معترض نے عظیم بیگ کے مصائب اور آلام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے
کہا ہے کہ وہ غم میں ہنسنا جانتے ہیں۔ صرف عظیم بیگ نہیں بلکہ سینکڑوں ایسے
لوگوں کی مثالیں مل جائیں گی جنھوں نے غم کو اپنے قہقہوں میں گم کر دیا۔ یہ دراصل
زندگی سے فرار ہے اور قہقہوں میں اپنے آپ کو چھپانے کی ناکام کوشش ہے۔ یہی
سبب ہے کہ عظیم بیگ کی نثر میں چند لمحات کے قہقہے ہیں مگر گرمی جذبات کا
پتہ نہیں۔ ان کے یہاں صداقت کی کمی ہے۔ ان کے ہونٹوں پر جو ہنسی ہے
اس کی آواز دل کے ساتھ ہم آہنگ نہیں ہے اس کمی کی وجہ سے ان کے کارنامے
حسین مگر بے روح بن کر رہ جاتے ہیں۔ اور ان کا معیار سطحی درجہ سے آگے نہ بڑھ
سکا۔ ان کے یہاں غم کی رفعت۔ اس کا نفسیاتی پہلو۔ اور حکیمانہ عرفان تلاش
سے بھی نہیں ملے گا۔ فانی بھی چاہتے تو غم کا تدارک قہقہوں سے کر سکتے تھے
ان کو بھی اپنے مصائب میں مسکراہٹوں کا سہارا مل سکتا تھا مگر انھوں نے غم دور
کرنے کے لیے مسکرانا بھی گناہ خیال کیا۔ جو لوگ زندگی کو مسرت و شادمانی

کے پیمانوں سے ناپنے کی کوشش کرتے ہیں ان کو برنارڈ شا کی یہ تنبیہہ یاد رکھنا چاہیئے کہ "محض احمق آدمی خوش رہنا چاہتا ہے" اگر یہ تسلیم کرلیا جائے کہ زندگی غم و خوشی سے بالاتر شے ہے تب بھی ہم کو اس منزل تک پہونچنے کے واسطے غم کا سہارا لینا پڑے گا۔

اس سلسلہ میں فانی پر تیسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ ان کا تصوف حقیقی نہیں ہے ورنہ یاس و تصوف دو متضاد چیزیں ہیں۔[1]

معلوم یہ ہوتا ہے کہ معترض کے ذہن میں تصوف کا ایک رسمی نظریہ ہے اور انھوں نے اس پیمانے پر اس کو ناپنے کی کوشش کی ہے۔ فانی کے تصوف کے سلسلہ میں ہم گذشتہ ابواب میں کہہ آئے ہیں کہ ان کا تصوف عملی نہیں بلکہ نظری ہے۔ اس نظری تصوف نے اگر کائنات کو کچھ نہیں بخشا تو شعر و ادب کو ضرور ایسی روح عطا کی جس سے اس کا بلند معیار قائم ہوگیا۔ جب ہم فانی کو صوفی کہتے ہیں تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ان کے یہاں عملی تصوف ہے بلکہ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا مزاج اور لہجہ دونوں تصوف سے ہم آہنگ ہیں۔ مختلف مذاہب میں تصوف کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ عیسائی مذہب نے رہبانیت کی تعلیم دی۔ ہندو مذہب نے یوگ، بدھ مت نے نروان کا تصور پیش کیا جن مذاہب نے ترک دنیا کی تعلیم نہیں دی انھوں نے بھی دنیا کی بے حقیقتی کا درس ضرور دیا۔ مذہب اسلام کی دوسرے مذاہب کے مقابلے میں امتیازی حیثیت یہ ہے کہ اس نے دنیا میں رہ کر دنیا کی آلودگیوں سے کنارا کرنے کی تعلیم دی ہے۔

---

[1] دوسرا رخ۔ از سید حامد علی گڈھ میگزین فانی نمبر

دنیا سے فرار ہر شخص اختیار کر سکتا ہے مگر اس کے مصائب کا پامردی سے مقابلہ کرنا مومن کی شان ہے ایک مرد مومن اور منکر میں یہی فرق ہے کہ مومن غم کائنات کو تصوف کی مدد سے گوارا بنا دیتا ہے اور منکر اس سے فرار اختیار کرتا ہے۔ انھیں خیالات کی روشنی میں فانی کے تصوف کو دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں رہ کر دنیا سے گذر جانے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس جگہ ایک اور حقیقت کا اظہار ضروری ہے۔ تصوف ایک خاص نظام فکر ہے جس میں سالک پر مختلف اوقات میں مختلف قلبی کیفیات طاری ہوتی ہیں کبھی قبض کے اثرات غالب ہوتے ہیں کبھی بسط کے۔ کبھی وہ تجلیات کے انقطاع سے افسردہ اور کبھی ان کے تواتر سے شگفتہ ہوتا ہے۔ ہم یہاں مثالاً چند اشعار رومی کے پیش کرتے ہیں جن سے ہمارے دعوے کی تصدیق ہو گی۔

آہ کے بار دگر آتشے در من فتاد
ویں دل بے خود شدہ روئے بہ صحرا نہاد

آہ کہ دریائے عشق بار دگر موج زد
از جگر ہر طرف چشمۂ خوں برکشاد

آہ کہ زد آتشے دامن جاں در گرفت
در د گرفت آسماں آتش من یافت باد

کیا ان اشعار کی بنا پر کوئی ذی ہوش شاعر کے الم کی شدت اور اس کی صوفیانہ نسبت پر حرف گیری کر سکتا ہے۔ فانی کے یہاں لفظ 'یاس' سے ممکن ہے لوگوں کو غلط فہمی ہو کہ وہ خدا کی طرف سے مایوس ہو چکے تھے اور ممکن ہے کہ لوگ خدا انداشت والا قطعہ[1] (جو فانی نے اپنے مرنے کی پیشین گوئی کے طور پر لکھا تھا) پیش کریں

---

[1] او از جہاں گذشت کہ آخر خدا نہ بود
او آں چناں بہ زیست کہ گوئی خدا انداشت

طغیانِ ناز بیں کہ بہ لوح مزار او
ثبت است سالِ رحلتِ فانی 'خدا انداشت'

مگر بقول فانی، خدا اند اشت، سے گھبرانے والوں نے طغیان ناز کو نہیں دیکھا فانی کے یہاں یاس خدا کی طرف سے مایوسی کے معنی میں کبھی نہیں آیا نہ وہ کبھی شوپنہاور کی طرح کسی اندھی مشیت کے قائل ہوئے۔ دنیا اور اہل دنیا کی طرف سے مایوسی کا اظہار، ان کی زندگی کا تجربہ تھا۔

دل کے سوا یہاں کوئی محرم دردِ دل نہیں بے خبر دل سے کیوں کہیں اہل خبر سے کیا کہیں

تصوف دراصل ایک بنیادی نظریہ ہے جو انسان کے عقائد و اعمال پر دیرپا اثر رکھتا ہے۔ یہ بنیادی عقیدہ اسی وقت انسان کے دل میں جاگزیں ہوتا ہے جب اس کا دل سوز و گداز سے نرم ہو چکا ہو اور یہی نرمی و گداز معرفت الٰہی کا پہلا زینہ ہے جو غم کی بدولت حاصل ہوتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ غم اور تصوف کے ڈانڈے آکر مل جاتے ہیں۔ تعجب ہے کہ معترض نے فانی کے ان اشعار پر نظر نہیں ڈالی۔ جن میں وہ کامل یقین کے ساتھ خدا کی رحمت سے رجوع کرتے ہیں۔ اس قسم کی مثالیں چند ایک نہیں بلکہ ہر ہر قدم پر مل سکتی ہیں۔

یہ محشر ہے یہاں جو چاک ہے رحمت بداماں ہے
وہ دنیا تھی جو ہنستی ہی رہی ہر چاک داماں پر

ذکر خورشید قیامت سن کے واعظ کیا کہوں بجز اس تر دامنی کو روز محشر دیکھنا
ترے کرم سے یہ سماں ہے عالم گناہ کا سیاہیاں امید کی تجلیاں لیے ہوئے
میری نگاہ معترف عجز خاک تھی تیری نظر نے خاک کو انساں بنا دیا
قربان تری شان کریمانہ پہ ہر بات اب بات بہ انداز کریمانہ بنا دے
فانی کے دل سے آیۂ لاتقنطو کے بعد زاہد وہ دل فریبی حسن عمل گئی
فضل تیرا شفیع طاعت و زہد عدل عاصی نواز عصیاں پوش

جو شعر یاد آئے ان کو یہاں سپرد قلم کر دیا گیا۔ یہ اور اسی قسم کے کافی اشعار فانی کے کلام میں مل جائیں گے جن سے ایک مرد مومن کا عزم۔ ایک مسلمان کی شان اعتماد آشکار ہوتی ہے پھر کون کہہ سکتا ہے کہ فانی کا تصوف اس کے قلبی واردات کا نتیجہ نہیں ہے کون کہہ سکتا ہے کہ فانی جب آلام روزگار سے پریشان ہوتا ہے تو وہ یاس و نا امیدی میں لاتقنطو کا دامن بھی چھوڑ دیتا ہے۔

فانی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں بے کیف ایک رنگی ہے ان کے خیالات میں تنوع نہیں ہے[1] اسی سلسلہ میں دوسرے معترض کا خیال ہے کہ شعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ تخیل کو پرواز عطا کرے اور یہ چیز چونکہ فانی کے یہاں مفقود ہے اس لیے ان کی شاعری نے ہم کو کچھ نہیں بخشا۔[2]

جہاں تک اسالیب بیان کے تنوع کا سوال ہے اس کو معترض نے خود اپنے اسی مضمون میں تسلیم کیا ہے کہ ان کی طرز ادا میں پرکاری اور اسالیب بیان میں تنوع ہے۔ ان کے یہاں گہرائی بھی ملتی ہے اور گیرائی بھی۔ مگر اس کے ساتھ اس امر کا انکار کرتے ہیں کہ ان کے یہاں خیالات میں بھی تنوع ہے۔ لفظ تنوع اپنے اندر مختلف پہلو رکھتا ہے۔ ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ شاعر زندگی کے گوناگوں مسائل کی ترجمانی کرے۔ جو ہم کو غالب اور اقبال کے یہاں ملتی ہے۔ وہ تمام کائنات پر چھا کر اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ان کے خیالات کی وسعت کا یہ عالم ہے۔ ع

بقدر شوق نہیں ظرف تنگنائے غزل

---

[1] دوسرا رخ۔ از سید حامد۔ علی گڑھ میگزین (فانی نمبر)

[2] فانی کے نظریہ حیات کا اثر۔ از خلیل الرب (فانی) مرتبہ عبدالشکور

مگر اسی کے ساتھ صورت یہ بھی ہو سکتی ہے کہ صرف ایک حقیقت کے مختلف گوشوں
کو اجاگر کیا جائے۔ جیسا کہ درد و مومن، داغ اور حسرت کے یہاں ہے۔ فانی کائنات
پر اس طرح حاوی نہیں جیسے غالب۔ بلکہ اس کے ایک پہلو پر اس طرح چھا جاتے
ہیں کہ اس کا ہر گوشہ بے نقاب کر دیتے ہیں۔ اس وصف میں وہ مومن سے
زیادہ مشابہ ہیں۔ مومن کی شاعری صرف حسن و عشق کی داستانوں تک محدود
تھی مگر ان حدود میں رہ کر مومن نے اپنی طبیعت کی جولانیاں دکھائی ہیں فانی بھی
زندگی کے صرف ایک گوشۂ غم پر اپنی نظر مرکوز رکھتے ہیں۔ مگر غم کی
ماہیت پر وہ اتنے حاوی نظر آتے ہیں کہ غالب کے مقابلے میں ان کی
حیثیت شریک غالب کی ہے۔ وہ غم کو ہر زاویہ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ نہ صرف اس
کی ماہیت پر نظر ڈالتے ہیں بلکہ فلسفیانہ نظر سے ان کا تجزیہ بھی کرتے ہیں۔ غم کو جتنی
ژرف نگاہی سے فانی نے پرکھا ہے اردو ادب کے کسی اور شاعر نے نہیں پرکھا۔

یہ چیز خاص طور پر یاد رکھنے کی ہے کہ فانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ نہ
تو غالب و مومن کی دلی تھی اور نہ انیس و دبیر کا لکھنؤ۔ شاعری کی آوارہ روح اپنے لیے
ٹھکانا تلاش کر رہی تھی۔ فانی کی نادرہ کار طبیعت نے اس کو نشان منزل دیا۔ گلستان
ادب کو شادابی اور طراوت کی ضرورت تھی۔ فانی نے اپنے خون سے اس کو رنگ جاوداں
عطا کیا۔ وہ غم کو درد بھی خیال کرتے ہیں اور دوا بھی۔ ان کو زندگی میں لطف اس
وقت آتا ہے جب ان کی آرزوئیں ناکام رہیں۔ غرض طرز فانی کے کلام پر غم ہی غم
چھایا ہوا ہے مگر کمال یہی ہے کہ وہ غم کو بے تکلف نہیں بننے دیتے اور نہ موت
کی ہیبت ناکی سے پریشان ہوتے ہیں نہ لکھنوی شعرا کی طرح بلک بلک کر روتے ہوئے
نظر آتے ہیں۔ آخر وہ روئیں بھی تو کیوں۔ جب کہ ان کی "موت"، "زندگی سے

(نوٹ صفحہ ۱۵۴ پر)

زیادہ دلکش ہے، ان کی خزاں، کا رنگ بہار سے زیادہ دلفریب ہے، وہ ان ارمانوں کو انعام خداوندی سمجھتے ہیں جو ان کی سعی کا حاصل نہیں ہونے پاتے۔ وہ دولتِ دوجہاں پر دل بتلا، کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کا غم بے کیف بے رنگ نہیں۔ اس میں کوئی تلخی نہیں۔

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں — مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا
دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں — دردِ جب تک نہ ملے دل نہیں ہونے پاتے
میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول — تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

یہ امر موجب اطمینان ہے کہ معترضین نے فانی کو اس الزام سے بچا دیا جو عام طور پر غزل گو شعرا پر وارد ہوتا ہے کہ ان کی غزل مختلف مضامین کی وجہ سے معجون مرکب بن جاتی ہے۔ ان لوگوں پر اعتراض کیا جاتا ہے کہ وہ ایک شعر میں نشاط و شادمانی کے ترانے گاتے ہیں اور دوسرے شعر میں آہ و فغاں۔ فریاد و شیون کے ہنگامے برپا کرتے ہیں۔ مگر فانی کے یہاں صرف ایک موضوع۔ ایک عنوان اور ایک سرخی "غم" ہے اور یہ یک رنگی ہی فانی کی معراج کمال ہے۔ اس محدود دائرہ کو وسعت بخشنا ہر شاعر کا

(نوٹ بقیہ صفحہ ۱۵۳ کا)

نہ نکالی جا رہی ہیں ہڈیاں کچھ قید خانے سے — اسیران محبت کو وہ آج آزاد کرتے ہیں
وداع دل ہجوم آرزو میں کیا کہوں تجھ سے — بھرے گھر سے جنازہ جیسے اے ہمدم نکلتا ہے
(عزیز لکھنوی)

سوارت ہو گیا مرنا مریض شام ہجراں کا — کہ وہ بالیں پہ آئے اور آئے بھی تو منہ ڈھانپے
(محشر لکھنوی)

تھا۔ شاعری کا مذاق عام تھا اور اہل علم کے علاوہ کم خواندہ اور بعض ناخواندہ شعرا بھی خوش کلامی کی داد حاصل کر لیتے تھے شاعری میں استادی شاگردی کی روایت عام تھی اور متعدد شعرا جو درجہ استادی کے مدعی تھے اپنے شاگردوں کی فوج ظفر موج کے ساتھ مشاعروں میں بالالتزام شرکت کرتے تھے۔ بدایوں میں مشاعروں کی کثرت کی بدولت ایک مخصوص فضا قائم ہو گئی تھی اس کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ اکثر مقامات کے مقابلے میں بدایوں میں شعر گوئی اور شعر فہمی کا معیار عموماً بلند رہتا تھا لیکن اس کے ساتھ نکتہ چینی اور خوردہ گیری کا رجحان مختلف "دبستانوں" کے درمیان معارضوں اور آویزشوں کی صورت میں اختیار کر لیا گیا تھا جس کی بدولت بعض اوقات ادبی فضا مکدر ہو جاتی تھی اور سودا اور میر ضاحک یا انشا اور مصحفی کے معرکوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔

خیر ذکر اس ماحول کا ہو رہا تھا جس میں فانی نے آنکھ کھولی اور جب چاروں طرف دیکھا تو پوری فضا شعر و ادب سے معمور نظر آئی۔ ان کے سامنے وہ روایات بھی تھیں جن کے نقوش آہستہ آہستہ تاریخ کے اوراق پر جذب ہوتے جا رہے تھے۔ وہ شعری روایات جو محشر۔ وحشت۔ محو۔ بے خود سے ہوتی ہوئی فانی تک پہونچی تھی اس نے بہت کچھ اپنا رنگ بدل لیا تھا۔ حسرت موہانی نے جس غزل کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھالا تھا اس کو فانی نے صحت مند روایات عطا کیں۔ فانی کے زمانے تک بدایوں کی شعری روایات کی وہ شان تو باقی نہیں رہی تھی جس کے قصے کتابوں کے اوراق میں پڑھتے تھے۔ مگر پھر بھی اس وصف میں اس کو دوسرے شہروں سے اب بھی امتیاز حاصل تھا۔ فانی کی شخصیت کی تشکیل میں جن عناصر نے حصہ لیا ان کا سرسری اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا۔ اور شاید اب ان کی شخصیت کا جائزہ لیتے وقت کسی قسم کی الجھن کا احساس

کام نہیں ہے۔ اس کے لیے تخیل کی بلند پروازی اور نگاہ کی ژرف کاری کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لیے شاعر اور فلسفی دونوں کی سی یک وقت نگاہ چاہیئے۔ بہ تقاضائے بشریت ان کے یہاں یاس کے جذبات بھی ملتے ہیں مگر عام حالات میں ان کا فلسفہ بہت بلند ہے۔ وہ ہمارے خیالات کو اتنا بلند کر دیتے ہیں جو انسانی ترقی کا منتہائے کمال ہے۔ رفعت و ندرت خیال کی بہترین مثالیں دیکھنا ہوں تو یہ اشعار پڑھیئے۔

خود برق ہو اور طور تجلا سے گذر جا
خود شمع بن اور وادی سینا سے گذر جا

بے واسطہ خود نگری اپنی طرف دیکھ
آئینہ اٹھا حسن خود آرا سے گذر جا

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک
اس مرحلۂ سعی تماشا سے گذر جا

اے عزم جگر ہوش کے پردوں کو الٹ دے
اے ذوق نظر محمل لیلیٰ سے گذر جا

دوسری غزل کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا
رخ مگر جانب ساحل نہیں ہونے پاتے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

خود تجلی کو نہیں اذن حضوری فانی
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

بعض اوقات فانی تخیل کے بعض اجزا اس طرح چھوڑ جاتے ہیں کہ جس بلندی پر سے وہ صدا دے رہے ہیں وہاں تک جانے کا راستہ کاوش سے تلاش کرنا ہوتا ہے اور ان کی رفعت پرواز کو چھونے کے لیے دوسروں کو بھی اتنی ہی پرواز کرنی پڑتی ہے اگر کوئی اس بلندی تک پہونچنے میں ناکام رہے تو فانی کو سمجھنا معلوم۔ اس اعتراض کا دوسرا جزو کہ فانی کی شاعری نے ہمیں کچھ نہیں بخشا۔ اسی طرح مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے جیسا کہ اس کا پہلا جزو۔

تنقید کا ایک غلط اصول یہ ہے کہ ہمارے ناقد شاعر یا ادیب پر اپنی مرضی تھوپتے

ہیں یعنی ایک شخص سے ایسی چیز کا مطالبہ کرتے ہیں جس سے اس کو سروکار نہیں ہے۔ مثلاً شاعر سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ اپنی شاعری کے ذریعے کسی سیاسی یا مذہبی عقیدے کی تبلیغ کرے یہ ایسا ہی ہے جیسا ایک مصور سے موسیقی کی نمائش کرنا اگر ایک مصور فن موسیقی میں بھی ید طولیٰ رکھتا ہے تو یقیناً ایک باکمال انسان ہے لیکن اگر وہ صرف ایک اچھا مصور ہے تب بھی اس کے کمالات اپنی جگہ لائق ستائش ہیں۔ حقیقت میں دیکھنا یہ ہے کہ وہ جس راستہ پر جا رہا ہے کیا اس کے مطالبات پورے کرتا ہے؟ اگر وہ اس کے مطالبات سے عہدہ برآ ہوتا ہے تو یقیناً ایک بلند مرتبہ فن کار ہے۔ ورنہ اس کا فن اس کے حق میں رحمت نہیں لعنت ہے۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کوئی شخص میر سے بچول نظموں۔ غالب سے ترقی پسند شاعری۔ انیس سے جرأت کی معاملہ بندی کی توقع کرے اس اصول کی روشنی میں اس اعتراض پر نظر ڈالیے کہ فانی نے ہم کو کچھ نہیں دیا۔ اگر معترض ان کے کلام میں سیاسی تحریکات سماجی مسائل کی توقع کر رہے تھے تو یقیناً ان کو مایوسی ہوئی ہوگی۔ فانی نہ سیاست داں تھے اور نہ واعظ۔ وہ صرف شاعر تھے اور آرٹسٹ۔ وہ دل کے ٹوٹے ہوئے ارمانوں کو شعر کے سانچے میں ڈھالا کرتے تھے۔ انھوں نے ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے اپنے فرائض کو بہ حسن و خوبی انجام دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ کوئی آرٹسٹ زندگی کو کچھ بھی بخشنے کی صلاحیت نہیں رکھتا تو فانی نے بھی زندگی کو کچھ نہیں بخشا۔ لیکن اگر یہ تسلیم کیا جائے کہ آرٹ بھی زندگی کا ناگزیر جزو ہے تو فانی نے زندگی کو آرٹ بخشا۔ ارسطو کا خیال ہے کہ المیہ کا درجہ طربیہ سے بلند ہے۔ شیلی کا قول ہے کہ ہمارے سب سے شیریں نغمے وہ ہیں جن میں

غم کی لے ملتی ہے۔ فانی نے زندگی کو المیہ کا احساس جمالیاتی حسن کے ساتھ عطا کیا۔ شاعر کو چند خود ساختہ تیوروں کا پابند کر دینا زندگی اور شاعر دونوں کی توہین ہے کسی کو کیا حق ہے کہ شاعر پر قید لگائے کہ نغمہ ہو مگر اس سے حزن و ملال کے راگ نہ نکلیں صرف سرور و انبساط کے سر پیدا ہوں۔ فانی نے ہمارے سخت دلوں کو جذبات اور جذبات کو گرمی بخشی۔ انھوں نے انسانی جذبات کا احترام کیا ان سے کھل کھیلنے کی اجازت کبھی نہیں دی۔ انھوں نے شاعر کو روحانیت کی رفعت عطا کی۔ جب وہ منزل آتی ہے جہاں درد سراپا درد بن جاتا ہے جب شاعر کا اپنا غم کائنات کے غم میں مدغم ہو جاتا ہے۔ جب موت زندگی کے بھیس میں رقصاں نظر آتی ہے۔ اس وقت وہ زندگی کو اس سطح سے نہیں دیکھتا جہاں عوام کی رسائی ہو۔ اس کا اپنا زاویہ نظر ہوتا ہے۔ اس کا اپنا فلسفہ زندگی ہوتا ہے۔ اس کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔

فانی پر ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں ٹھوس خارجی احساس کا فقدان ہے اس کے برخلاف غالب بین الاقوامی ادب میں MASTER OF (REALITY) کی حیثیت سے جگہ پاتا ہے۔ معترض کا خیال ہے کہ غالب کے اشعار میں سچے اور زندہ تجربے نظر آتے ہیں۔ اس کے برخلاف فانی بزم تماشا کے وجود کا "ذوق نظر" کی حد تک قائل ہے[۱]۔ آگے چل کر معترض نے اعتراف کیا ہے کہ فانی کے یہاں مفکرانہ گہرائی بھی ہے اور روایت ادب کا خوش سلیقہ اہتمام بھی اور تڑپا دینے والے نشتر بھی۔ لیکن اس کو شکایت ہے کہ کہیں ہے تو

---

[۱] بے ذوق نظر بزم تماشا نہ رہے گی — منھ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

ذوق و شوق کی وہ تلازم آشامی جو دنیا کی ہر چیز کو حسین اور دلکش بنادے[1]

غالب اور فانی کا موازنہ کرتے وقت اگر یہ کہا جائے کہ غالب کے کلام میں زندگی کے تجربوں کا تنوع ہے تو درست ہے لیکن یہ کہنا کہ فانی کے یہاں ٹھوس خارجی احساس کا فقدان ہے۔ اور غالب کے یہاں نہیں ہے تو یہ فیصلہ بڑی حد تک یک طرفہ ہے۔ ہمیں سب سے پہلے یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ غزل کا شمار خارجی شاعری میں نہیں ہے بلکہ داخلی میں ہے۔ شاعر اپنے جذبات و احساسات کی دنیا میں رہتا اور اس کی ترجمانی کرتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ دوسرے بھی اس سے لطف اندوز ہوں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ غزل کی داخلیت بھی خارجی محرکات سے یکسر بے نیاز نہیں ہوتی تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ ان خارجی محرکات کے باوجود تجربات شاعر کی ذاتی زندگی کے داعیات کا ٹھپہ رکھتے ہیں اس لیے ہم غزل کو داخلی کہتے ہیں۔ لیکن اس کا ایک پہلو اور بھی ہے وہ یہ کہ شاعر کے تجربات اگر واقعی زندگی اور خصوصاً شاعر کی زندگی سے ہم آہنگ ہیں تو ان میں آفاقی صداقت بھی پائی جائے گی۔ غزل کی ہئیت کے ان دونوں پہلوؤں کو پیش نظر رکھتے ہوئے غالب فانی میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ دونوں اپنی زندگی کے اندرونی تجربے بیان کرتے ہیں اور چونکہ وہ تجربے ایک متوسط حساس اور ذہین انسان کے تجربے ہیں اس لئے ان میں ایک گونہ ہمہ گیر انداز پایا جاتا ہے سوال یہ ہے کہ ان دونوں میں فرق کیا ہے؟ ہمارے خیال میں غالب و فانی میں جو کچھ فرق ہے وہ اطلاق و (DENOTATIO) اور وصف،

---

[1] مالہٗ وما علیہ از صبیح احمد کمال۔ نگار اپریل ۱۹۴۹ء

(CONNOTATION) یا بالفاظ دیگر کیت (QUANTITY) اور کیفیت (QUALITY) کا ہے۔ اس کو یوں کہا جا سکتا ہے کہ غالب کی فکر میں وسعت زیادہ ہے اور فانی کے یہاں گہرائی زیادہ ہے۔ فانی نے غم و عشق کے مضامین ایسے پیرایہ میں ادا کیے ہیں جو عام شاعر یا مفکر کے بس کے نہیں ہیں انھوں نے نفسیات کی تہہ میں ڈوب کر حقائق کے نازک اور نادر موتی نکالے ہیں۔ ان مضامین پر غالب نے بھی کہا ہے اور خوب کہا ہے لیکن شاید اس نزاکت سے نہیں۔ ان کی تصویروں میں مو قلم کے وہ باریک خطوط نہیں جو فانی کے یہاں ملتے ہیں لیکن اس کے برخلاف ان کے یہاں بہت سے ایسے مضامین ہیں جو فانی کے یہاں مفقود ہیں۔ غالب نے زندگی کے ہر پہلو کو دیکھا اور ہر پہلو کے بارے میں اپنے تجربے کمال فن کے ساتھ پیش کر دئے۔ فانی کے یہاں وسعت خیال کی وہ مثالیں تو نہیں ملیں گی جو غالب کے یہاں ہیں البتہ غم کے تجربات میں ڈوب کر جس زندگی کی کھوج فانی لگاتے ہیں وہاں غالب کی رسائی نہیں۔

یہ کہنا کہ فانی کی تخیل، نرم تماشا، ہی تک محدود ہے غلط ہے۔ اشعار ذیل کو پڑھیے اور ذرا فانی کی اس محدود نظر، کو دیکھئے کہ اس کی رسائی کہاں تک ہے۔

مرا وجود ہے۔ میری نگاہ خود نشناس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا

تری تلاش کا افسانہ گریباں ہوتا
رہ مجاز کا ہر ذرہ اک زباں ہوتا

حجاب اگر من و تو کا نہ درمیاں ہوتا
پیام حسن و محبت کی داستاں ہوتا

تھا حریم نازاں کا دل کی آخری منزل
ہم نے ان کو ڈھونڈھا تھا مل گیا نشاں اپنا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی   وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

معترض کو ایک اعتراض یہ بھی ہے کہ فانی کے یہاں تڑپا دینے والے نشتر تو ہیں لیکن ذوق و شوق کی کمی ہے جو ہر شے کو حسین بنا دے۔ اس امر میں معترض کو یقیناً کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ فانی ہی کی ذات دنیائے ادب میں ایسی نظر آتی ہے جس نے بھیانک سی بھیانک اور مہیب سے مہیب شئے کو بھی حسین بنا دیا ہے۔ موت۔ گور و کفن۔ زنداں۔ جبر۔ فراق جیسی لرزہ خیز حقیقتوں سے بڑھ کر اور کیا خوفناک چیزیں ہوں گی۔ مگر یہی موت جب فانی کے یہاں آتی ہے تو حسین اور دلکش بن جاتی ہے۔

ادا سے آڑ میں خنجر کے منھ چھپائے ہوئے   میری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

محشر میں جبر دست سے طالب ہوں داد کا
آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

ہاں شب ہجر آج صبح نہ ہو   ہاں چلی جائے یاد زلف دراز
زندگی یاد دوست ہے یعنی   زندگی ہے تو غم میں گزرے گی

خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسم گل آ گیا زنداں میں بیٹھے کیا کریں

نگار میں مالۂ و ما علیہ کے تحت فانی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا گیا ہے کہ فانی کے برخلاف غالب کی غزل شاعر کی صحیح اور مکمل نمائندگی کرتی ہے۔ فانی کے یہاں خلوص تو ہے لیکن تحریک غم کتنا گزیر ہونے کا احساس مفقود ہے اور اسی لیے معلوم ہوتا ہے کہ اشعار باوجود نفسیاتی سچائی کے صرف سطح کی پیداوار ہیں اور بڑی حد تک ہنگامی مشق کا نتیجہ ہیں[۵]۔

---

۵ مالۂ و ما علیہ۔ مسیح احمد کمالی۔ نگار اپریل ۱۹۴۹ء۔

شاید اس سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی آرٹسٹ کسی اندرونی جذبہ سے متاثر ہو کر اپنے آرٹ کو بروئے کار لاتا ہے تو مبصرین کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کا آرٹ ایک خاص احساس کا نتیجہ ہے اور وہ احساس آرٹسٹ کے اندر اس قدر شدید اور پرجوش ہے کہ لامحالا اس مخصوص آرٹ کی شکل میں ڈھل گیا ہے۔ معترض کے نزدیک اگرچہ فانی کے یہاں خلوص ہے مگر ان کی شاعری میں یہ احساس مفقود ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اعتراض قطعاً غیر صحیح ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک شاعر یا آرٹسٹ کے یہاں خلوص ہونا اور تحریک فن کے ناگزیر ہونے کا احساس زیادہ متضاد چیزیں نہیں ہیں۔ بجز ان شعرا کے جو طرح کو سامنے رکھ کر قافیہ پیمائی کر لیا کرتے ہیں اور قافیوں پر مصرعے لگاتے چلے جاتے ہیں۔ کسی بڑے شاعر کا کلام اس احساس سے خالی نہیں ہوتا یہ اور بات ہے کہ بعض جگہ یہ احساس زیادہ شدید ہو اور بعض جگہ کم۔ ورنہ اگر اسی قسم کی بدگمانی کو راہ دی گئی تو غالب یا میر یا کوئی شاعر بھی ہدف اعتراض ہونے سے بچ نہیں سکتا جب معترض نے یہ تسلیم کر لیا کہ فانی کے کلام میں خلوص موجود ہے یعنی جو کچھ وہ محسوس کرتے ہیں وہی کہتے ہیں تو ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس تضاد کی گنجائش کیونکر نکل سکتی ہے کہ وہ تحریک فن کے ناگزیر ہونے کے احساس سے عاری ہیں اس لیے کہ عقل یہ چاہتی ہے اور ادبیات کے اصول بھی اس کے مؤید ہیں کہ خلوص صرف اسی کے کلام میں ہو سکتا ہے جس میں دل پر گذری ہوئی واردات کا بیان ہو اور ظاہر ہے کہ اس خلوص کے ساتھ سطحیت کا دخل ناممکن ہے۔ لہٰذا معترض کا ان کے خلوص کے اعتراف کے ساتھ یہ کہنا کہ ان کے اشعار صرف سطح کی پیداوار ہیں اور پختگی مشق کا نتیجہ ہیں۔ اپنے ہی بات کی تردید کرنا ہے۔ ایک پختہ مشق شاعر کے یہاں فنی اسقام کا ضرور پتہ نہیں ہو گا مگر نفسیاتی سچائی صرف واردات قلب

کے ترجمان ہیں کے یہاں ملے گی جس کو اس نے اپنے خون دل سے سینچ سینچ کر پروان چڑھایا ہے۔

اکثر معترضین فانی کی شاعری میں اس تضاد کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ وہ ایک لمحہ میں تو غم سے گریزاں نظر آتے ہیں اور دوسرے وقت میں اس کو سینہ سے لگانے کی تمنا کرتے ہیں کبھی ان پر غم کا یہ اثر ہوتا ہے کہ وہ رنج والم سے گرانبار ہو جاتے ہیں اور کبھی ان کے چہرے پر مسکراہٹ نظر آتی ہے۔

اس سوال کے جواب میں فطرت کا یہ اصول یاد رکھنے کے قابل ہے کہ انسانی... زندگی میں کیفیات اور جذبات کا بدلنا ایک ناگزیر امر ہے۔ زندگی سے مایوس مریض کی زندگی میں کچھ لمحات ایسے ضرور آتے ہیں جب وہ مسکرا اٹھتا ہے۔ اپنی زندگی سے مایوسی کے باوجود وہ دوسروں کو زندگی کی اہمیت سمجھاتا ہے اس کو برتنے اور سلیقہ سے گذارنے کی تعلیم دیتا ہے۔ یہی حال فانی کا ہے وہ بھی انسان تھے اور انسانی تقاضوں سے بے تعلق نہیں تھے۔ چنانچہ یہ واقعہ مشہور ہے کہ ایک دن نواب نثار یار جنگ حیدرآباد میں فانی سے ملنے گئے۔ مزاج پرسی کے بعد نواب صاحب نے فانی سے کہا "فانی تم مر نہیں سکتے تمہاری انرجی ضائع نہیں ہوئی" وہی فانی جو مرگ ناگہاں کے انتظار میں زندگی گذارا کرتے تھے ان الفاظ کو سن کر ان کا چہرہ مسکرا اٹھا وہ چند لمحات کے لیے ایک نئی زندگی کے تصور میں محو ہو گئے۔ یہی سبب ہے جب ان کو دنیا تیرہ و تار نظر آتی ہے تو بے ساختہ پکار اٹھتے ہیں۔

گذرے گی نہ اب غم کا مداوا کیے بغیر بنتی نہیں اجل سے تقاضا کیے بغیر

سلہ فانی بدایونی از ماہر القادری علی گڑھ میگزین ۔ فانی نمبر

نامرادی حد سے گذری حال فانی کچھ نہ پوچھ
ہر نفس ہے اک جنازہ آہ بے تاثیر کا

یاس نے دردی نہیں حق تو یہ ہے دوا بھی دی
فانی ناامید کو موت کا آسرا دیا

دیارِ عمر میں اب قحط مہر ہے فانی
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

مگر ان کے غم سے جو گریز کی کیفیت ملتی ہے وہ بہت عارضی ہے۔ ان کے یہاں گریز کے ان لمحات کی طرح خوشی اور مسرت کے لمحات بھی عارضی ہیں۔ کون کہہ سکتا ہے کہ فانی کے چہرے پر یہ مسکراہٹ بھی آسکتی ہے۔

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

اب نہیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے

ابرو اٹھا سمت حرم سے زاہد
تو بھی سجادہ الٹ۔ جام اٹھا

نرگس گل پھر بچھا رہی ہے نسیم
آیئے موسم بہار آیا

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی

اس قسم کے اشعار ان کے کلام میں جگہ جگہ مل جاتے ہیں۔ مگر یہ مسرت و شگفتگی بھی عارضی ہے۔ ان کے یہاں عام طور سے وہ کیفیت ہے جو غم کو گوارا بنا دیتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کے غم میں شدت تو ہے مگر تلخی نہیں۔

مجھ کو مرے نصیب نے روز ازل نہ کیا دیا
دولت دو جہاں نہ دی اک دل مبتلا دیا

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

مزاج دہر میں ان کا اشارہ پائے جا
جو ہو سکے تو بہر حال سکرائے جا

جلوہ محسوس سہی آنکھ کو آزاد تو کر
قید آداب تماشا بھی تو محفل سے اٹھا

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو
ان کے آگے جو بار بار آیا

ہم قیامت کو قیامت ہی نہ سمجھے روز حشر
حشر تک آنکھ نہیں شاید جلوہ جانانہ تھا

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم تیرا
مگر من جملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا

ادا سے آڑ میں خنجر کے منھ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

نہیں ہوگا

ہماری المیہ شاعری کی کہانی میر کی پُر درد زندگی سے شروع ہوتی ہے یہ غم نصیب شاعر ایک ایسے ماحول میں پیدا ہوتا ہے جہاں اس کو غم عشق کے ساتھ غم روزگار سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔ کتاب الم کا دوسرا باب مغلیہ دور کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کی زندگی سے شروع ہو کر دہلی کی تباہی پر منتہی ہوتا ہے۔ اسی کہانی کی تیسری قسط فانی کی روداد غم ہے۔ جوان کی ذات سے شروع ہو کر انھیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ ان تمام غم نصیب شاعروں میں دو شخصیتیں سب سے پیش پیش نظر آتی ہیں۔ میر اور فانی۔ دونوں کا غم ذاتی ہے مگر ذاتی تجربات نے آفاقی رنگ اختیار کر لیا ہے یہ دونوں اپنے میں ڈوب کر کائنات پر چھا جاتے ہیں۔ اور کہیں وجدان کی سرحدیں پار کر کے کائنات کو اپنے اندر سمو لیتے ہیں۔ ان دونوں کا تصور غم اور فلسفۂ زندگی اپنا ہے مستعار نہیں۔ غم کا کون سا پہلو ہے جس سے وہ نا آشنا ہوں۔ اور اذیت کی کون سی سرحد ہے جس کو انھوں نے پار نہ کیا ہو۔ ان دونوں کے غم کے بارے میں آئندہ صفحات میں تفصیل سے بحث کریں گے۔ سردست ہم کو فانی کی شخصیت کا مطالعہ کرنا ہے۔ جس سے ان کی شاعری کا پس منظر اجاگر ہو جائے۔

فانی ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو بلسی (بدایوں) میں پیدا ہوئے[1]۔ شاہ عالم کے عہد میں ان کے مورث اعلیٰ اصالت خاں کابل سے آئے اور دربار دہلی سے وابستہ ہو گئے۔ مغلیہ سلطنت نے جو مردم شناسی اور قدر دانی میں

---

[1] بعض لوگ ان کی پیدائش اسلام نگر (ضلع بدایوں) میں بتاتے ہیں جو غلط ہے۔ مباحث و مسائل۔

اُردو غزل میں فانی کا مقام

غزل پر بحث کرتے ہوئے علامہ شبلی نے سچ کہا تھا۔
"عشق و محبت انسان کا خمیر ہے۔ اس لیے جہاں انسان ہے، عشق بھی ہے اور چونکہ کوئی قوم شاعری سے خالی نہیں اس لیے کوئی قوم عشقیہ شاعری سے بھی خالی نہیں ہو سکتی۔ لیکن ایران اس خصوصیت میں اور تمام ملکوں سے بڑھا ہوا ہے۔ یہاں مدت دراز کے تمدن نے انسانی جذبات کو نہایت لطیف اور زود اشتعال بنا دیا تھا اس لیے ذرا سی تحریک سے یہ شعلہ بھڑک اٹھتا تھا اور دل و دماغ کو آتش فشاں بنا دیتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایران میں جس قدر عشقیہ شاعری کو ترقی ہوئی اور اصناف سخن کو نہیں ہوئی"[1]

درحقیقت فارسی شاعری نے غزل کی صنف اور حسن و عشق کے موضوع پر جو قیمتی سرمایہ چھوڑا ہے وہ ادبیات عالیہ کی جان ہے۔ واردات قلبی کے نازک سے نازک جذبے اور روداد عشق کے چھوٹے سے چھوٹے معاملے کو ایرانی شاعر جس لطف سے کہہ جاتا ہے اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اہل دل سنیں اور کلیجہ تھام کر رہ جائیں۔ ایک طرف سعدی کے ترانے ہیں جو اپنے فطری جذبات اور شیریں انداز سے دل موہ لیتے ہیں۔ دوسری طرف حافظ کے نغمے ہوتے ہیں جن کی عارفانہ

---

[1] شعر العجم جلد پنجم

کے اور رندانہ سرمستی، مجاز کے ڈانڈے حقیقت سے ملا دیتی ہے کہیں خسرو کا سوز و گداز ہے کہیں حسن بدایونی کا اثر آفریں انداز۔ عرفی کا فلسفہ نظیری کا تغزل۔ بیدل کے افکار کی گہرائی و گیرائی۔ غالب کی شوخی و رعنائی جدھر دیکھئے۔ ع

کہ شمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجا ست

باتیں وہی ہیں جو ہم اور آپ اکثر دیکھتے اور سنتے آئے ہیں۔ لیکن ان کے زبان و قلم کی بدولت یہی باتیں سحر سامری بن جاتی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ اول تو یہ شعرا حساس طبیعت اور چوٹ کھایا ہوا دل رکھتے تھے۔ اکثر نے تو دنیا کو دیکھنے کی طرح دیکھا تھا اور نظر کی وسعت اور تجربہ کی دولت حاصل کی تھی۔ لیکن اسی کے ساتھ نظر پر لطافت کا پرتو اور تجربہ پر عشق کی چھاپ تھی۔

در دل ما غم دنیا غم معشوق شود بادہ گر خام بود پختہ کند شیشہ ما

دوسرے غزل کی ترقی کا زمانہ اور تصوف کی گرم بازاری کا دور ایران میں تقریباً ایک ہی تھا اور ظاہر ہے کہ تصور کا خمیر سرمایۂ عشق و محبت ہی ہے۔ رومی نے کیا خوب کہا ہے ؎

جرعۂ خاک آلود چوں مجنوں کند صاف اگر باشد ندانم چوں کند

نتیجہ یہ ہوا کہ ادھر رومی، عراقی، سعدی، حافظ، عرفی، جامی نے عشق کے ساز پر کوئی نغمہ چھیڑا ادھر تمام ملک کی فضا گونجنے لگی، ہندوستان کی فارسی شاعری اور بعد کو اردو شاعری کی لہریں بھی ایران ہی کے سرچشمے سے نکلی ہیں۔ حتیٰ کہ قدیم اردو شعرا میں بہت کم ایسے افراد ہوں گے جنھوں نے اردو کے ساتھ فارسی کلام بطور یادگار نہ چھوڑا ہو۔ مگر ہمیں یہاں عام شاعری سے

نہیں بلکہ غزل اور اردو غزل سے بحث کرنا مقصود ہے۔

غزل بڑی سی کافر صنف ہے جو مشکل سے کسی کے قابو میں آتی ہے۔ دراصل غزل بہت آسان بھی ہے اور نہایت دشوار بھی۔ اور ہر بزم مشاعرہ میں غزل گو اصحاب کی تعداد سینکڑوں تک پہونچ جاتی ہے تاہم ایسے غزل نگار جن کا کلام سن کر سامعین چونک پڑیں معدودے چند ہی ہوتے ہیں۔ شعرا کے تذکرے دیکھ جائیے۔ غزل گویوں کا ایک جم غفیر ملے گا لیکن ممتاز اساتذہ غزل گو شاید دس پندرہ سے زیادہ نہیں ہیں۔ میر، سودا، درد، سوز۔ قائم مصحفی، آتش، مومن، غالب، داغ پر قدیم غزل گوئی کا خاتمہ ہو جاتا ہے ان کے بعد حالی، اقبال، شاد، حسرت، فانی، اصغر، جگر کا عہد آتا ہے جنھوں نے پرانے طرز شاعری میں انقلاب پیدا کیا۔ اور غزل کو نیا آب و رنگ دیا۔ جب یہ حال ہے تو سمجھ لیجئے کہ جو شخص اس محدود صنف میں اپنے لیے ایک مستقل اور باوقار مقام حاصل کر سکتا ہے وہ کس قدر بلند پایہ ہوگا فانی بھی ان کاملین فن میں ہیں جن کا مرتبہ غزل میں تمام ناقدین ادب نے تسلیم کیا ہے۔

صنف غزل کی مشکلات سے ہم کو انکار نہیں۔ اصل میں تو وہ حسن کے کرشموں عشق کے ولولوں۔ وصل کی شادکامی۔ ہجر کی زارنالی اور اسی قبیل کے مضامین کے بیان کے لیے وضع کی گئی تھی۔ لیکن بعد کو اس کے دامن کی وسعت میں تصوف اخلاق سبھی کچھ سما گئے مگر شرط یہ ہے کہ انداز کی شعریت اور حسن کاری پر زد نہ آئے ورنہ وہ اور جو کچھ بھی ہو، غزل نہ ہوگی۔ پھر اس کی زبان لاانتہا سے زیادہ ترنم اور شیریں، اور پیرایہ اس قدر ہلکا پھلکا ہو کہ سامع پر گراں نہ گذرے۔ اسی کے

ساتھ غزل کا ہر شعر بجائے خود خیال کی ایک یونٹ ہو جو ہر اعتبار سے خود مکتفی ہو نظم کے برخلاف جس کا ہر شعر دوسرے شعر کا محتاج ہوتا ہے سب پر مستزاد بحر قافیہ اور ردیف کی قیود جو دوسری اصناف کی طرح غزل کے لیے بھی ناگزیر ہو گئی ہیں۔ امیر مینائی نے جب کہا تھا کہ

امیر اک مصرع تر تب کہیں صورت دکھاتا ہے
بدن میں خشک جب ہوتا ہے شاعر کا لہو برسوں

تو یقیناً ان کی نظر میں غزل کی یہی پابندیاں رہی ہوں گی۔

شاید یہی اسباب تھے کہ گذشتہ چند برسوں میں غزل کے خلاف مخالفت کا ایک سخت طوفان اٹھا تھا اور ڈر تھا کہ غزل اس طوفان کی تاب نہ لائے گی اور ہمیشہ کے لیے فنا ہو جائے گی لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ آخر وہ طوفان فرو ہو گیا اور غزل پہلے سے زیادہ قوت کے ساتھ ابھری۔

غزل پر معترضین نے جو فرد جرم لگائی ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

(۱) غزل غیر فطری ہے کیونکہ اس میں منتشر خیالات ہوتے ہیں۔

(۲) اس کا انداز روایتی ہے

(۳) وہ جاگیردارانہ عہد وحشت کی یادگار ہے۔

(۴) اس میں غیر ضروری قیود ہیں۔

چونکہ ہماری زبان کے فاضل اہل قلم ان اعتراضات کے مفصل اور مدلل جواب دے چکے ہیں اس لیے ہم یہاں ان سے قطع نظر کرتے ہیں اوپر عرض کیا گیا تھا کہ فانی الشعرا میں ہیں جن کا شعری مرتبہ تمام ناقدین نے تسلیم کیا ہے۔ قبل اس کے کہ اس پر تفصیلاً اظہار خیال کیا جائے چند باتیں پیش نظر رہنا چاہییں۔

فانی کے تمام سوانح حیات پر روشنی ڈالنا تو ان کے سوانح نگار کا فرض ہے تاہم یاد رکھنا چاہیئے کہ انھوں نے ایک ایسے خاندان میں آنکھ کھولی جو ثروت و وجاہت میں امتیازی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ روبہ زوال ثروت و وجاہت فانی کے دیکھتے دیکھتے برائے نام رہ گئی۔ وہ قدرت کی طرف سے ایک حساس طبیعت اور ایک تاثر پذیر دل لے کر آئے تھے۔ ان حالات سے ان کا متاثر ہونا عین تقاضائے فطرت تھا۔ اس پر باپ کی سخت گیری۔ مالی مشکلات اور بعض عزیزوں اور دوستوں کی بے مروتی اور زمانے کی ناقدری نے ان کو متشائم بنا دیا۔ جہاں تک خیال ہے عشق اور اس کی ناکامیوں نے بھی ان کے دل پر گہرا اثر چھوڑا تھا۔ علاوہ بریں وہ ایک معزز افغانی النسل خاندان کی فرد تھے۔ اس لیے بعید نہیں کہ وہ نیاز مندی عالی ظرفی۔ وضعداری، مروت اور غیرت جو ان کے اخلاق کا طرۂ امتیاز تھی، خاندانی ورثہ کا نتیجہ ہو۔ ان کا مذاق سخن فطری تھا جس پر بدایوں کے ادبی ماحول اور بریلی کالج اور ایم اے او کالج علی گڈھ کی سنجیدہ صحبتوں نے اور بھی جلا کر دی۔

فانی کی شاعری کا مطالعہ کرتے وقت اس دشواری کو بھی سامنے رکھنا پڑے گا کہ فانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ خواہ شاعری کے لیے ساز گار ہو مگر اردو غزل کے لیے سازگار نہ تھی۔ سرسید تحریک اور اس سے متاثر ہونے والے لوگ ایک ایسے ادب کے خواہاں تھے جس کا کوئی افادی پہلو سامنے ہو ان کو اپنے خواب کی تکمیل نظم میں نظر آئی۔ حالی کے مقدمہ شعر و شاعری نے غزل کو اور بھی پیچھے ڈھکیل دیا لیکن غزل کی مقبولیت کہئے یا سخت جانی کہ اس نے پیچھے ہٹنے کے ساتھ ہی اس طرح جست لی کہ غزل کے مخالفین دیکھتے رہ گئے۔ غزل کے احیا کی قیادت اگرچہ حسرت کر رہے تھے مگر فانی کا

کارنامہ یہ ہے کہ اردو غزل کو نئی سمت میں موڑا اور مواد اور اسلوب دونوں کے اعتبار سے اس میں نئی وسعتیں اور نئی صلاحیتیں پیدا کیں۔[1] اس میں کوئی شک نہیں کہ حسرت اور فانی کی کوششوں کا اثر ہے کہ غزل ایک نئی قوت اور توانائی کے ساتھ ابھری۔"

اگرچہ جو تھوڑا بہت فارسی کلام فانی نے چھوڑا ہے یا اردو میں غزل کے علاوہ جن اصناف پر انھوں نے طبع آزمائی کی ہے وہ بھی کسی طرح نظر انداز کیے جانے کے قابل نہیں۔ لیکن اردو غزل ان کی معراج کمال ہے اور اسی نے ان کو اردو شاعری میں ایک مستقل مقام عطا کیا ہے۔ اس لیے یہاں اسی کے بارے میں اظہار خیال مقصود ہے۔

فانی کی غزلیہ شاعری عشق۔ غم، تصوف اور اسرار کائنات کے محوروں کے گرد گھومتی ہے۔ چاہیں تو یہ کہہ لیجیے کہ عشق کی بدولت فانی غم سے دوچار ہوئے اور غم کی جب جلا ہوئی تو اس نے تصوف کے آستانے تک پہنچایا اور تصوف نے اسرار کائنات سے پردہ اٹھایا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ یہ موضوعات فانی کے یہاں روایتی اور رسمی نہیں ہیں۔ انھوں نے ان پر فکر کی ہے۔ برتا ہے اور محسوس کیا ہے اور اس طرح یہ ان کی ہستی کا جزو بن گئے ہیں۔ یہ خیالات اور جذبات ہمارے اکثر شعراء کے یہاں تقلیدی رنگ میں ملتے ہیں مگر فانی کے یہاں ان پر شاعر کی شخصیت کی چھاپ صاف نظر آتی ہے۔ رہی ان کی زبان اور تراکیب خاص اس کے بارے میں ان کو اپنے وطنی ماحول اور اپنے فارسی ذوق سے خاص مدد ملی۔

اب ہم ان موضوعات کو الگ الگ بیان کرتے ہیں۔

---

[1] غزل سرا مجنوں گورکھپوری

(الف) عشق:۔ عشق کی ابتدا اور حسن کی روداد غزل کی جان ہے اور فانی شاعرانہ ذوق کے ساتھ عاشقانہ مزاج لے کر آئے تھے۔ اس لیے ان کی شاعری ہر چہ گوید دیدہ گوید کی مصداق ہے۔ ان کو قریب سے دیکھنے والوں نے ان کے حسن پرستی اور ذوق جمال کے بعض واقعات سنائے ہیں۔ جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حسن کا احترام ہی نہیں، عشق کا رکھ رکھاؤ بھی مدنظر رکھتے تھے۔ ان کی طبیعت میں ایک خاص رچاؤ اور بھاری بھرکم پن تھا جو ان کو بوالہوسی کی پستیوں میں گرنے سے باز رکھتا تھا۔ آیئے دیکھیں کہ ان اشعار سے اس کی تصدیق کس حد تک ہوتی ہے۔ ان کا شعر ہے۔

غم کیا ہے اگر منزل جاناں ہے بہت دور   کیا خاک رہ یار ہوا بھی نہیں جاتا

منزل جاناں تک رسائی دشوار سہی مگر اس کی راہ میں خاک ہو جانا تو دشوار نہیں

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز   کوئی تو اہل وفا کا مزاج داں ہوتا

اہل وفا کے مٹانے کے لیے معشوق کی ہر ادا قاتل ہو سکتی ہے۔ کچھ جفا ہی پر زد تو نہیں۔

وحشت بقید چاک گریباں روا نہیں   دیوانہ تھا جو معتقد اہل ہوش تھا

فانی کا عشق اور جنون دونوں رسم پرستی سے بالا ہیں۔ ان کی وحشت مسلم مگر کیا ضرور کہ اس کی خاطر گریبان ہی چاک کیا جائے۔ ع

عشق کاریست کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

یہاں، انھوں نے حسب عادت الفاظ کو خاص مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے یعنی دیوانہ نادان کے معنی میں اور اہل ہوش رسم پرستوں کے معنوں میں گریبان پھاڑنے

والوں) کے معنی ہیں "درجنوں از خود نہ رفتن کار ہر دیوانہ نیست"

تھی ہر تڑپ سکون کی دنیا لیے ہوئے — پہلو میں آپ تھے کہ دل ناصبور تھا

شاعر عشق میں اس منزل پر پہنچ گیا ہے جب ہر تڑپ میں اس کو آرام ملتا ہو اس موقع پر محبوب سے پوچھتا ہے کہ شاید میرے پہلو میں دل نہ تھا بلکہ آپ تھے ورنہ آرام ملنا کیا معنی۔ عشق کی بے تابی اور بے تابی سے چین آجانا اوروں نے بھی لکھا ہے مگر یہ توجیہہ صرف فانی کا حصہ ہے۔

بالیں پہ تم جب آئے تو آئی وہ موت بھی — جس موت کے لیے مجھے جینا ضرور تھا

دوست کا بالیں پر آنا اور عاشق کا جان دے دینا۔ عاشق کی دنیا کا عام واقعہ ہے۔ لیکن فانی کے اچھوتے طرز بیان نے اس میں خاص ندرت پیدا کر دی۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس موت کی تمنا میں جی رہا تھا کہ ادھر تم آؤ ادھر میں جان نذر کر دوں۔ "وہ موت بھی" کا ٹکڑا اسی پہلو کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

اٹھ کر چلے تو حشر بھی اٹھا تھا کیا ضرور — ان کی گلی سے مدفن فانی تو دور تھا

محبوب اپنی گلی سے اٹھ کر چلا (اپنی حشر خرامی کا مظاہرہ کرنے یا رقیب سے ملنے کے لیے) اور اس کے اٹھتے ہی قیامت برپا ہو گئی۔ شاعر کہتا ہے کہ اگر وہ اٹھے تھے تو کم از کم حشر ہی نہ اٹھاتے۔ اور اٹھانا ہی تھا تو مدفن فانی کے قریب اٹھایا ہوتا۔ اس کے بعد فانی پر کیا گزرتی اس کو سامع کے ذوق پر چھوڑ دیا ہے۔

میرے دل غیور کا حسن طلب تو دیکھ — گویا زباں پہ حرف تمنا گراں نہ تھا

حسن طلب یہ ہے کہ کوئی چیز لطیف پہلو سے مانگے۔ عاشق کا دل غیور ہے اس لیے حرف تمنا کا زبان پر لانا کارے دارد۔ تاہم زبان پر آیا گو اس کی خودداری کا خون ہو گیا اس "حسن طلب" کی بھی اگر قدر نہ ہو تو وائے بر عاشق۔

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ — آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

شعر میں مومن کا سا انداز ہے۔ یعنی محبوب سے اپنی غرض اس طرح بیان کرنا کہ اس کو اپنا فائدہ نظر آئے۔ ظاہر ہے کہ جب وہ آئے گا تو عاشق کے گھر کا نقشہ بدل جائے گا۔[1]

اٹھتی نہیں ہے تہمت نظارہ جمال — منہ دیکھتا ہوں جلوہ نظارہ ساز کا

داغ نے کہا تھا

عالم تمام چشم حقیقت نگر بنا — آئینہ دیکھتا ہے منہ آئینہ ساز کا

لیکن فانی اس دیکھنے کو دیکھنا نہیں کہتے۔ نظارہ ساز کی ترکیب ملاحظہ ہو جو بتا رہی ہے کہ کسی نے نظارہ کو ایک عارضی نمود دے دی ورنہ نظارے کی کوئی اصلیت نہیں۔

کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں — دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

حضرت رضی بدایونی نے کہا تھا۔

جلوہ دکھا کے حضرت موسیٰ کو چھپ گئے — کیا اور کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

مگر فانی کا نقطہ نظر مختلف ہے۔

وعدے کی رات گردش افلاک رک گئی — جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

پروفیسر سرور کے قول کے مطابق فانی کے یہاں فکر اور جذبے کا بہت حسین امتزاج ملتا ہے۔ وہ جو کچھ لکھتے ہیں سوچ کر لکھتے ہیں۔ مگر اس کے ساتھ جذبات کی گرمی اور بیان کی شعریت تاثیر کا وہ طلسم پیش کر دیتی ہے کہ آدمی مسحور ہو کر رہ جاتا

---

[1] تاباں بدایونی کا شعر ہے۔

اپنی آنکھوں سے ذرا دیکھنا تاثیر قبول — تم بھی ہنگام دعائے سحری آ جانا

ہے۔ اس کی یہ تعبیر کہ زمانہ بگڑ گیا، شاعر کی جودت ذہن کا کمال ہے۔

دے اس کو جان جس کو غرض ہو کرل کے بعد ان کی نگاہ کا وہ تقاضا نہیں رہا

محبوب کی ادائیں دل لیتی ہے۔ جان لینا ان کا کام نہیں۔ یوں کسی (عاشق) کو غرض ہو اور جان نثار کرنے ہی پر تُلا ہو تو اس کو اختیار ہے کسی کو غرض ہو، سے جو بے نیازی ظاہر ہے وہ لطف سے خالی نہیں۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہونچی تری جوانی تک

مثل ہے کہ بات سے بات یاد آتی ہے۔ دوسرا کوئی شاعر کہتا تو یوں کہتا کہ جب تیری جوانی کا ذکر چھڑا تو قیامت کے قصے یاد آ گئے۔ مگر فانی روش عام پر چلنا اپنی وضع کے خلاف خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک قیامت اونا ہے اور اونا سے اعلا (جوانی) تک انتقال ذہن کے سامنے کی بات ہے۔

کس سے اب درد کی دوا چاہوں درد اٹھتا ہے لے کے تیرا نام

مصرع ثانی کے دو پہلو ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ درد بھی تیرا سہارا ڈھونڈھتا ہے۔ دوسرے یہ کہ تیرا نام لیتے ہوئے (دل میں) درد اٹھتا ہے۔ جب مرض اس حد کو پہونچ گیا تو علاج کیونکر ممکن ہے۔

نزع میں فانی چپکے چپکے تو نے یہ کس کا نام لیا
کیوں او کافر تیری زباں پر اب بھی خدا کا نام نہیں

شعر کیا ہے ایک مرقع حسرت ہے۔ عاشق دم توڑ رہا ہے۔ تیماردار آس پاس بیٹھے ہیں۔ عاشق کی زبان پر آہستہ آہستہ کسی کا نام آتا ہے (آہستہ اس لیے کہ راز محبوب رسوا نہ ہو جائے) تیماردار سمجھ جاتا ہے۔ کیونکہ اگر خدا کا نام ہوتا تو اس کے چھپانے کی کیا ضرورت تھی اور بے ساختہ پکار اٹھتا ہے ع

امتیازی حیثیت کی مالک تھی، خطابات۔ جاگیر اور منصب سے اصالت خاں اور ان کے بعد ان کی اولاد کو خوب نوازا۔ نواب بشارت خاں فانی کے پردادا بدایوں کے گورنر مقرر ہوئے۔ فانی کے سلف کی داستان خود فانی کی زبان سے سنیئے:۔

"میں ۱۳ ستمبر ۱۸۷۹ء کو دنیا میں لایا گیا۔ اب تک کہ دسمبر ۱۹۴۰ء ہے۔ خود کو زندہ سمجھتا ہوں نسلاً پٹھان ہوں۔ اصلی وطن کابل ہے اس طرح کہ شاہ عالم بادشاہ دہلی کے زمانے میں میرے مورث اعلیٰ اصالت خاں نامی ہندوستان آئے۔ دربار دہلی نے انھیں اور ان کے جانشینوں کو بہت کچھ نوازا۔ ممتاز عہدوں پر فائز کیے جانے کے علاوہ جاگیرات۔ خطابات منصب وغیرہ سے سرفراز کیے گئے۔ نواب بشارت خاں مرحوم میرے پردادا تھے، صوبہ بدایوں کے گورنر تھے تقریباً دو سو مواضعات پر ان کی جاگیر مشتمل تھی مگر زمانے کے انقلاب نے رفتہ رفتہ یہ نوبت پہونچادی کہ میرے والد محمد شجاعت علی خاں صاحب جو مورث اعلیٰ سے چھٹی پشت میں تھے پولیس کی ملازمت اختیار کرنے پر مجبور ہوگئے۔ چناں چہ قلیل آمدنی کے سہارے پر مرحوم نے اپنی ساری زندگی شرافت، دیانت۔ غیرت اور جرأت کے ساتھ گذار دی۔"[1]

فانی نے جس فضا میں آنکھ کھولی وہ فراغت کی زندگی تھی۔ یہ ضرور ہے کہ پولیس کی ملازمت کی آمدنی اس جاگیر کے مقابلہ میں کچھ نہ تھی۔ جو دو سو مواضعات پر مشتمل تھی۔ تاہم ایک آسودہ زندگی بسر کرنے کے لیے کافی تھی۔ ۱۹۰۱ء

---

[1] خود نوشتہ تذکرہ رسالہ نگار جنوری۔ فروری ۱۹۴۱ء۔

THIS EBOOK IS DOWNLOADED FROM
SHAAHISHAYARI.COM

LARGEST COLLECTION OF URDU
SHERS, GHAZALS, NAZMS AND EBOOKS.

کیوں ادکا فر تیری زبان پر اب بھی خدا کا نام نہیں

کہتے ہیں کہ کسی محفل میں جوش موجود تھے جس وقت فانی نے یہ مقطع پڑھا تو جوش بے چین ہو گئے اور بول اٹھے "فانی یہ مقطع بار بار پڑھے جاؤ، طبیعت کو سیری نہیں ہوتی" فانی کے یہاں کہیں کہیں معاملہ بندی کے اشعار ہیں مگر ابتذال سے پاک اور فطرت کے مطابق۔

دل ان کے نہ آنے تک لبریز شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

زبن پڑا کوئی عذر جفا کسی سے تو ہائے
ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

چند اشعار بغیر کسی تشریح کے سنیئے۔

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

ابھری ہوئی ہو چوٹ دل دردمند کی
رکھنا قدم تصور جاناں سنبھال کے

تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے

پڑتا نہیں اس آئینہ میں عکس کوئی اور
دل میں تری تصویر سی رکھ دی ہے کسی نے

موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم
کہ جنازے پہ وہ غارت گر خواب آتا ہے

زباں کٹتی ہے ذکر آشیاں پر
تمنا بھی بہت تھی آشیاں کی

فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے
کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رو دیا

تو تبسم بھی شریک نگہ ناز ہوا
آج کچھ اور بڑھائی گئی قیمت میری

دب غم:- ہمیں یہ اعتراف کرنے میں کوئی تامل نہیں کہ فانی کی شاعری

میں غم کا عنصر اسی طرح غالب ہے جس طرح ریاض کے یہاں خمریات کا۔ فرق یہ ہے کہ ریاض نے کبھی شیشے کی پری کو منھ نہیں لگایا۔ ان کے برخلاف فانی نوجوانی سے لے کر آخر عمر تک غم سے دو چار رہے۔ غم دوراں ہو یا غم جاناں بہر حال یہ حقیقت ہے کہ ان کی ہستی پیکر آلام رہی۔ جب یہ واقعہ ہے تو ان کے کلام میں غم کی ترجمانی پر چیں بہ جبیں ہونا یا نکتہ چینی کرنا کہاں تک حق بجانب ہے۔ بعض نے ان کو یاسیات کا امام ٹھہرایا اور بعض نے انھیں ہوۂ علم سوز خواں۔ ہر وقت بسورنے والا اور انسانیت سے گرا ہوا بتایا۔ مگر وہ تحسین اور طعن دونوں سے بالا تھے۔ نہ اس کا شکوہ نہ اس کی شکایت۔

غم آور د نقصانے نہ شادی داد سامانے
بہ پیش ہمت ما ہر کہ آمد بود مہمانے

اس مسئلہ پر ہم تفصیل سے دوسرے باب میں ذکر کر آئے ہیں۔ اس موقع پر یہ ضرور کہنا چاہتے ہیں کہ غم کا بھی نظام عالم میں ایک مقام ہے۔ شیلی نے خوب کہا ہے کہ ہمارے سب سے شیریں نغمے وہ ہیں جو غم کے ساز سے نکلے ہیں۔ طربیہ کے مقابلہ میں المیہ کی برتری کا یہی راز ہے۔ پروفیسر مسعود حسن کہتے ہیں۔ "غم شاعری کے لیے خوشی سے کہیں بہتر موضوع ہے۔ اس لیے کہ خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی ہے اور غم بلند ترین حیات کو بیدار کرتا ہے[1]۔"
اگر یہی ہوتا تو بھی مضائقہ نہ تھا لیکن فانی نے ایک قدم آگے بڑھایا اور غم کو حاصل حیات کر دکھایا۔ ان کی شعریت کی بدولت (جس کی جڑیں ان کی روح کی گہرائیوں تک پہونچی ہوئی تھیں) وہی غم جس سے انسان گھبراتا ہے عین مسرت اور وہی موت جس سے دنیا کانپتی ہے حاصل زندگی بن گئی۔ دراصل یہ کہنا کہ انھوں

---

[1] ہماری شاعری پروفیسر مسعود حسن رضوی

نے غم کی ترجمانی کیوں کی یا مثلاً اصغرؔ نے نشاط کے ترانے کیوں چھیڑے۔ ایک فطری شاعر کو بلا وجہ پابندیوں میں اسیر کرنا ہے دیکھنا صرف یہ ہے کہ جو کچھ انھوں نے کہا اس میں خلوص ہے یا نہیں اور ان کا کلام حسنِ شعر سے متصف ہے یا نہیں۔ خود فانیؔ نے ایک ریڈیائی تقریر میں اپنا نقطۂ نظر واضح کرتے ہوئے کہا ہے کہ "شعر کے لیے پہلی اور آخری شرط شعریت ہے اور شعر کا حاصل خود شعر ہے"۔ اس میں اس اعتراض کا جواب بھی آجاتا ہے کہ جب وہ یاسیات کے امام ہیں تو ہمیں ان کی اتباع سے کیا فائدہ۔ اگر فائدے سے کوئی مادی نفع مراد ہے تو فانیؔ سرے سے اس کے قائل ہی نہیں۔ ان کی زندگی ہمیشہ مادی نفع کی جستجو سے بالا رہی۔ آپ اس سے کبھی مادی منفعت یا عملی پیغام کی توقع ہی کیوں رکھیں کیونکہ وہ شاعر ہیں، رفارمر نہیں ہیں۔ لیکن اگر فائدے سے روحانی یا ذہنی حظ مطلوب ہے تو اس کی ان کے یہاں کمی نہیں۔ کلیم الدین نے فانیؔ کی تعریف کی ہے مگر اس کے ساتھ ہی ان کو شکایت ہے کہ "غالبؔ کی دنیا وسیع اور فانیؔ کی دنیا تنگ ہے"۔ مجنوںؔ بھی ان کے مسلسل شیوۂ فریاد کا شکوہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "ان کی شاعری میں ایک تھکا دینے والی یکسانیت پیدا ہوگئی ہے"۔ ہمارے نزدیک ان دونوں صاحبوں کے اعتراضات غیر صحیح ہیں۔ راقم نے اپنے مقالہ میں جو مومنؔ کی حیات و شعر سے متعلق ہے تفصیل سے بتایا ہے کہ غالبؔ کے مقابلے میں مومنؔ کی دنیا محدود تھی لیکن ان کی غیر معمولی طباعی نے عشق کے محدود موضوع میں وہ حیرت انگیز تنوعات پیدا کیے ہیں کہ ان کے کمال پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ تھکا دینے والی یکسانیت کا اعتراض بھی چنداں وقعت نہیں رکھتا۔ بلکہ ان گنے چنے موضوعات پر جو

فانی کو محبوب ہیں ان کی رنگا رنگ نادرہ کاری دیکھ کر قاری ایک تحیر آمیز مسرت محسوس کیے بغیر نہیں رہتا۔ یہ درست ہے کہ ان کے ابتدائی کلام میں (شاید لکھنؤ کے قیام کے اثر سے) کہیں میت۔ کفن اور جنازے کا ذکر ملتا ہے لیکن ایسے اشعار ان کے دیوان میں بہت کم ہیں اور بعد کو وہ اس رنگ سے کنارہ کش ہو گئے اس رنگ کے چند اشعار سنیے:۔

چلے بھی آؤ وہ ہے تیر فانی دیکھتے جاؤ تم اپنے مرنے والے کی نشانی دیکھتے جاؤ

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید کچھ اب کی بوے کفن دامن بہار میں ہے

نہ آئیں گے وہ تب بھی دم نکل ہی جائے گا فانی
مگر مشکل سے نکلے گا بڑی مشکل سے نکلے گا

ہجر نے کی مفارقت فانی لے مبارک ہو موت کا آغوش

دم بخود سکتے کا عالم مردنی چھائی ہوئی رنگ میری زندگی کا میری میت پر کھلا

لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ جلد ہی اس کوچہ سے نکل آئے۔ ان کے بعد کے کلام میں میت۔ کفن کا بھیانک اور ناگوار تصور نہیں ملتا۔ بلکہ موت اور غم کا وہ نکھرا ہوا اور بلند تصور ہے جس کو تغزل کی جان کہنا چاہیئے۔ اس تصور کی کیا نوعیت ہے آگے ملاحظہ ہو۔

جذبی صاحب نے کسی جگہ فانی کے حوالے سے بتایا ہے کہ انکے یہاں غم سے مراد صرف رنج یا دکھ نہیں بلکہ وہ عشق کا مترادف[1] ہے۔ کیونکہ عشق کے درد و سوز کے اظہار کے لیے غم کی اصطلاح نہایت موزوں ہے یہ صحیح ہے کہ فارسی

---

[1] خود فانی نے ایک جگہ غم کو وسیع معنوں میں کشاکش حیات کیلئے استعمال کیا ہے فرماتے ہیں

غم راز ہے انکی تجلی کا جو عالم بن کر عام ہوا دل نام ہے انکی تجلی کا جو راز رہی عالم نہ ہوئی

اور اردو میں غم کا لفظ عشق کے معنی میں بھی آیا ہے۔ مثلاً
حافظ: غم حبیب نہاں بہ زگفت و گوئے رقیب
کہ نیست سینۂ ارباب کینہ محرم راز
غالب: وو دَرعرض تمنّا بیکراں اندیشۂ عالم | یا تا سرم انداز بیا نست و بیاں نیست
میر: اس کی غمزہ کی مانند زنگار جس کا کھا دے
کام اپنا اس کے غم میں دیدار تک نہ پہونچا
مگر ہر جگہ ایسا نہیں ہے۔ فانی لکھتے ہیں:۔
غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی اگذشتنی | کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو
طول بدود از غم معاذ اللہ | عمر گذری ہے مختصر کرتے
بے شک انسان بشریت کے تقاضے کے باعث غم سے گھبراتا ہے لیکن وہ ایک وقت ایسا بھی آتا ہے کہ غم سے دل مانوس ہو جاتا ہے۔ اور وہی غم زندگی بن جاتا ہے۔ یہی حال فانی کا ہے۔ غم ان کا سہارا ہی نہیں، ان کا محبوب ہے اور موت ان کو گوارا ہی نہیں، ان کا مطلوب ہے۔ کیوں؟

۱۔ غم یادِ دوست کا ذریعہ ہے ۲۔ ہرچہ از دوست می رسد نیکوست
۳۔ ٹوٹے ہوئے دلوں پہ خدا کی خاص نظر رہتی ہے۔ غم کو انعامِ الٰہی سمجھنا چاہئے
۵۔ دراصل غم کے بغیر دل جو عرشِ الٰہی کہلاتا ہے دل نہیں ہوتا۔
اس طرح:۔
(۱) موت کا تصور دنیا کے علائق کا علاج ہے۔
(۲) موت زمانے کے مصائب سے نجات دیتی ہے۔
(۳) اس کے بغیر حقیقی زندگی (وصالِ دوست) حاصل ہونا محال ہے۔

(۴) زلیست بے وفا ہے مگر مرگ حق رفاقت ادا کرتی ہے۔

(۵) موت اہل عشق کا کچھ بگاڑ نہیں سکتی۔

مثالوں سے یہ بات زیادہ واضح ہو جائے گی۔

کوئی جھٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

زہے تقدیر ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری
تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو
میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

فانی سکونِ موت نے دل سے مٹا دیا
وہ نقش بے قرار کہ دنیا کہیں جسے

آج روز وصال فانی ہے
موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

موت ہی ساتھ دے تو دے فانی
عمر کو عذر بے وفائی ہے

لذت فنا ہر گز گھٹتی نہیں لیکن
دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

میتھیو آرنلڈ کا قول ہے کہ شاعری ایسی تنقید حیات ہے جو قوانین حسن و صداقت کے تابع ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تعریف فانی کی شاعری پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے زندگی کے مسائل پر تبصرہ جس طرح انھوں نے کیا ہے اس کی مثال مشکل سے ملے گی۔ پھر اس حسن شعریت کے ساتھ کہ بڑے سے بڑے مخالف کو بھی ماننا پڑے گا کہ وہ خشک سے خشک مضمون میں اپنے انداز سے جو ان کا اپنا ہے جان ڈال دیتے ہیں۔ رہی صداقت، اس کے بارے میں یہ امر ملحوظ رہے کہ ان کی شاعری اور ان کی زندگی میں کوئی تضاد نہیں۔ وہ جو کچھ واقعی محسوس کرتے ہیں وہی ان کی زبان و قلم پر آتا ہے۔ غم اور اس کے متعلقات پر جو کچھ انھوں نے لکھا ہے وہ ہماری زبان کا شاہکار ہے۔ مثالیں ان کے دیوان میں بکثرت پھیلی ہوئی ہیں۔ مگر طول کلام کے ڈر سے ترک کرنا پڑیں۔

(ج) تصوف :۔ فانی نہ تو صوفی تھے نہ کسی شیخ طریقت سے بیعت کی نوبت آئی ان کا ماحول بھی تصوف سے بیگانہ نہ تھا۔ خود ان کے والد کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہابیت کی طرف مائل تھے۔ وہابیت اور تصوف میں کوئی دور کا بھی تعلق نہیں۔ مگر لطف یہ ہے کہ ان کا تصوف رسمی نہیں تھا۔ انھوں نے تصوف کا مطالعہ کیا اس پر نگر کی اور اس کو اپنی زندگی کا جزو بلکہ کل بنالیا۔ حقیقت ہے کہ معشوق یکتا ہے صفات ہی میں یکتا نہیں، وجود میں بھی لاشریک ہے جلوۂ یکتائی معشوق کے سوا دہر میں کوئی اصل نہیں۔ تمام کائنات ایک آئینہ ہے جس میں وہ اپنے جمال جہاں آرا کا مشاہدہ کرتا ہے۔ خصوصاً ایک شاعر جب یہ حقیقت حال بن کر چھا جاتی ہے تو اس کے ذوق و شوق، جذب و مستی کی حد نہیں رہتی رومی ہوں یا عراقی، حافظ ہوں یا جامی۔ سب اسی میں مست نظر آتے ہیں فانی بھی اس زمرے میں نظر آتے ہیں۔ ان کے یہاں صوفیانہ موضوعات میں جو گہرائی اور تاثیر پائی جاتی ہے وہ کم شعرا کے یہاں ہے مثلاً لاموجود الا اللہ تصوف کا نقطۂ آغاز و انجام ہے جس پر لکھنے والوں نے بہت کچھ لکھا ہے۔ فانی کو بھی سنیے

تری تلاش کا فی الجملہ ماحصل یہ ہے — کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

وہ ہمیں ملے تو جب کہ ہم اس سے الگ ہستی رکھتے ہوں۔

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی — وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا
کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا — یہ راز ہے کہ کوئی راز داں نہیں ملتا
مراد جو د ہے میری نگاہ خود نشناس — وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو راز داں ہوتا

عاشق کی نگاہ جلوہ گاہِ معشوق کے سوا کچھ نہیں۔

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا — اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

لوگ کائنات کو مجاز اور ذات دوست کو حقیقت کہتے ہیں۔ فانی کو یہ دوئی بھی گوارا نہیں۔

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرق مجاز و حقیقت کیا
یہ عرض حقیقت ہے وہ حقیقت ہستیٔ باطل کوئی نہیں

ایک جگہ فرماتے ہیں:

ہے کوئی شے تو یار و جلوۂ یار وہ حقیقت ہے اور یہ اصل مجاز

مجاز نہیں کہا بلکہ اصل مجاز کہا۔ یعنی جس کو دنیا مجاز کے نام سے یاد کرتی ہے اس کی بنیاد جلوۂ یار ہے اس پر بھی ان کو اطمینان نہ ہوا تو کہا۔

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز
صور و منصور و طور اے توبہ ایک ہے تیری بات کا انداز
جانتا ہوں حقیقت باطل ماسوا تو ہے ماسوا کی قسم

ایک موقع پر نہایت نادر انداز میں بے خود اور خود دار دونوں کی منزل ایک ہی بتائی ہے۔ اول الذکر حقیقت کی تلاش میں اپنے آپ کو کھو بیٹھتا ہے، اور آخر الذکر یہ سمجھ کر کہ میں اس کا عین ہوں اس کو پا لیتا ہے۔

ترک خودی ہے ہوش عشق، درک خودی ہے جوش عشق

خود شناس و خود شناس جو ہے خدا شناس ہے

جب ایسا ہے تو پھر یہ کائنات اور خود ہم کیا ہیں۔ اس کا جواب ملاحظہ ہو

آدمی میں کچھ نہیں۔ آپ نے سمو دیا عالم غبار کو عالم خیال میں
ابتدائے زندگی۔ انتہائے زندگی آپ کے خیال سے آپ کے خیال میں

صوفیہ اسی بات کو اپنی زبان میں اعیان ثابتہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ آخر

اس تمام کارخانے کی نمود کی کیا مصلحت تھی۔

عرض ناز راز ہے کثرت مجاز کا آئینے سے لگ گئے پر تو جمال میں
آخر زمانہ آئینہ دکھلا کے رہ گیا لانا پڑا تمھیں کو تمھاری مثال میں

آخری شعر فانی کی آیات کمال میں شمار ہونے کے قابل ہے۔ ایسے دقیق مفہوم کو اتنی بھرپور شعریت کے ساتھ ادا کرنا ہر کسی کے بس میں نہیں۔ یہ خیال رہے کہ شعریت گنتی نپے تلے پیمانے کا نام نہیں ہے۔ بلکہ یہ ایک ذوقی چیز ہے جس کے بارے میں آخری بات جو کہی جا سکتی ہے یہ ہے کہ

بسیار شیوہاست بتاں را کہ نام نیست

فانی نے جو سرمایہ شعر چھوڑا ہے وہ زیادہ نہیں ہے۔ تاہم اگر وہ بھی نہ ہوتا تو ایسے اشعار ہی ان کے بقائے نام کے لیے کافی تھے۔ شعر کا مطلب یہ ہے کہ جب ہم محبوب حقیقی کے حسن کا تصور کرتے ہیں تو ہمارے ذہن میں حسن کا ... نصب العین کوئی خوبصورت انسان ہوتا ہے۔ یا جب اس کی عظمت کا خیال کرتے ہیں تو ہماری نظر میں کوئی عظیم الشان جبار شہنشاہ ہوتا ہے تو قطع نظر اس امر کے کہ وہ مثالیں ہماری محدود عقل ہی کی تخلیق ہیں، ہم یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جو پیمانے ہمارے سامنے ہیں وہ بھی تو اسی کی صفات کمال کا ادنا پرتو ہیں۔

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں آواز آ رہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

شاید افلاطون پہلا شخص ہے جس نے اس راز سے پردہ اٹھایا کہ ہمیں اس محدود زندگی میں کلیہ کا تصور کیونکر حاصل ہوتا ہے وہ کہتا ہے کہ عالم ناسوت میں آنے سے پہلے روح انسانی کو ایک ایسے عالم سے سابقہ رہا ہے جہاں اس کو حسن مطلق

میں انھوں نے بی، اے اور ۱۹۰۸ء میں ایل ایل بی کی ڈگری حاصل کی۔ اسکے بعد لکھنؤ۔ آگرہ۔ بدایوں اور بریلی میں وکالت کی۔ جس سے ان کو دلچسپی نہ تھی یہی سبب ہے کہ یہ پیشہ سازگار نہ آیا۔ ۱۹۳۲ء میں وکالت ترک کر کے حیدرآباد میں صدر مدرس کے عہدہ پر مامور ہوئے[1]۔ آخر ۱۹۳۹ء میں وہ ملازمت سے سبکدوش ہوگئے۔ اسکے بعد وفات تک وہ مالی مصائب اور ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہے۔

فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹا گیا

مصیبت بالائے مصیبت مہاراجہ سرکشن پرشاد جو فانی پر خاص کرم کرتے تھے دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اب فانی کی زندگی ایک ایسے دور سے گذر رہی تھی جس میں ہر طرف مایوسی و ناکامی نظر آتی تھی۔ احباب نے کنارہ کشی اختیار کرلی۔ فانی کی المیہ زندگی کا شباب تیام حیدرآباد سے متعلق تھا جب کہ وہ منازل شیب طے کر رہے تھے۔ آخر ۲۶ اگست ۱۹۴۱ء کو انھوں نے اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کر دی[2]۔

لو آج مرگ فانی بے کس سے مٹ گئی وہ اک خلش جو خاطر اہل وطن میں تھی

---

[1] خود نوشتہ سوانح، نگار جنوری ۱۹۴۱ء۔

(2)
HE RESTS HIS HEAD UPON THE LAP OF EARTH
A YOUTH TO FORTUNE AND TO FAME UNKNOWN
FAIR SCIENCE FROWND NOT ON HIS HUMBLE BIRTH
AND MELANCHOLY MARK'D HIM FOR HIS OWN.

خیر محض اور حق کلّی کا مشاہدہ میسّر تھا۔ اسی کی یاد دنیاوی زندگی میں رہ رہ کر آتی ہے ورنہ یہاں ان کلّی تصورات کا وجود کہاں۔ اسی مضمون کو دوسری جگہ ایک نئے پیرائے میں ادا کرتے ہیں۔

مجھ پر الزام پرستاری صورت کیا خوب
غور تری یاد وہی صورت گر آغوش ہوئی

دنیا (عالم مادی) کی حقیقت رقص اور صورت کدہ سے ذہن مانوس خیال کی طرف منتقل ہوتا ہے۔

یہ تو معلوم نہیں کیا ہے یہ دُنیا لیکن
عرصۂ حسرتِ رقص ہے صورت کدۂ جاں کوئی

اس زندگی میں وصال ممکن نہیں۔

فرصت یک نظر کے بعد حوصلۂ دعائے وصل
کیوں دل قدر ناشناس اب یہ مجال ہو گئی

کہتے ہیں کسی مجذوب نے علامہ اقبال سے پوچھا کیا چاہتے ہو؟ دولت، عزت اقبال نے انکار کیا۔ پوچھا کیا وصال چاہتے ہو؟ جواب دیا میری یہ جرأت نہیں اکر اس کی مصلحت میں اپنی مرضی کو دخل دوں) دنیا والوں کو ذرے تو نظر آتے ہیں صحرا نہیں دکھائی دیتا۔

اللہ رے چشم ہوش کی کثرت پرستیاں
ذرے ہی رہ گئے کوئی صحرا نہیں رہا

خدا کی جانب سے ہر لمحہ ہمیں فیضان وجود ہوتا رہتا ہے۔

میری ہستی گواہ ہے کہ مجھے
تو کسی وقت بھولتا ہی نہیں

اگر اس کا جمال بے حجاب ہو جائے تو پھر ہم کہاں۔

تعینات کی حد سے گذر رہی ہے نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

بعض صورتوں میں کفر بھی ایمان بن جاتا ہے یعنی ماسوا سے انکار۔

عشق وہ کفر کہ ایمان ہے دل والوں کا
عقل مجبور وہ کافر جو مسلماں ہو جائے

نیطرسی بھی اس کفر کے قائل ہیں ۔

ہیچ اکسیر بہ تاثیر محبت نہ رسد کفر آوردم و در عشق ایماں کردم

اصغر نے بھی اپنے رنگ میں یہی خیال پیش کیا ہے ۔

اے شیخ وہ بسیط حقیقت ہے کفر کی کچھ قید و رسم نے جسے ایماں بنا دیا

(ح) اسرار کائنات پر لمحہ فکریہ :۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ فانی کے یہاں تصوف عشق کی راہ سے آیا یا فلسفہ کی لیکن اسرار کائنات پر نظر تصوف ہی کی عینک سے دیکھنا شروع کیا۔ جہاں جہاں ان کو ذہنی الجھن پیش آئی اسی نقطۂ نظر سے ان کی گتھی سلجھائی اور ان اسرار کی نقاب کشائی میں ان کی مدد کی ۔ وہ ایک سوچنے والا دماغ اور ایک شاعرانہ طبیعت لے کر آئے تھے انھیں دونوں کی کارفرمائی ان کے کلام میں جا بجا نظر آتی ہے ۔ مثلاً :۔

ا ۔ جبر و قدر :۔۔۔۔۔۔ فلاسفہ اور اہل مذہب کی پرانی بحث صدیوں سے چلی آرہی ہے کہ انسان مجبور ہے یا مختار ۔ دونوں نے اپنی تائید میں دلائل کے انبار لگا دیئے ہیں ۔ چونکہ فانی کو تصوف سے غیر معمولی مناسبت ہے اور تصوف کائنات اور انسان کی ہستی کی مستقل حیثیت نہیں مانتا اسی نسبت سے انسان کے افعال بھی مستقل وجود نہیں رکھتے ۔ اس لیے قدرتاً ان کا میلان جبر کی طرف ہے ۔ بلکہ یہ کہنا چاہیئے کہ ان کو جبر کا عقیدہ نہایت مرغوب ہے جبر کو ثابت کرنے کے لیے فانی نے نئے نئے پہلو اور انوکھے پیرائے تلاش کیے ہیں جو ان کی ژرف نگاہی کی جولانگاہ کہے جا سکتے ہیں اور کمال یہ کہ خشک فلسفیانہ نظریات میں شعریت اس طرح سمو دی ہے کہ بڑے بڑے منکر کو بھی اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں ۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ ہم کو یہ آزادی

ملی ہے کہ اپنے راستہ کا تعین خود کر سکیں۔ لیکن تجربہ یہ بتاتا ہے کہ ہمارا کسی خاص راستہ پر گامزن ہونا کئی پہلے سے طے شدہ عوامل (وراثت۔ خارجی اثرات وغیرہ) کا نتیجہ ہوتا ہے۔ فانی کہتے ہیں۔

گلشن تصویر میں تھے طائر تصویر ہم — کیا کہیں کیونکر رہے مجبور بھی آزاد بھی

طائر تصویر دیکھنے میں تو پرواز میں ہے مگر جیسی پرواز کر رہا ہے وہ معلوم ہے۔

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

محشر میں جبر و دست سے طالب ہوں داد کا — آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

مجبوریٔ عریاں کو یہ خلعت مختاری — اللہ رے کرم ہم اور توفیق گنہگاری

یہی خیال شاعر کو اکساتا ہے کہ خدا کے حضور میں اپنی لغزشوں کا عذر پیش کرے۔

دو گھڑی کے لیے میزان عدالت ٹھہرے — کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے

بخش دے جبر کل کے صدقے میں — ہر گنہ میری بے گناہی کا

فطرت اختیار، حشر کے دن — آسرا ہے تری گواہی کا

فوراً متنبہ ہوتا ہے اور کہہ اٹھتا ہے۔

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی — سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

زنجیر اور وہ بھی دوست کے ہاتھ کی باندھی ہوئی۔ اس کا شکوہ کس منہ سے کیا جائے

جبر کو کیوں کہ نہ سمجھوں اختیار — تم نے باندھا ہے مجھے زنجیر سے

۲۔ تقدیر و تدبیر:——— اوپر والے قضیہ کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ہماری تدبیریں تمام تر مشیت الٰہی کی پابند ہیں۔ جیسا کہ حکیم امت حضرت علیؓ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رب کو فسخ عزائم سے پہچانا۔ مگر فرق یہ ہے کہ وہ تقدیر کی پابندی کے ساتھ تدبیر سے غافل نہیں تھے اور ہم تقدیر کے تو قائل ہیں مگر تدبیر سے غافل

بہر حال فانی کہتے ہیں ۔

رازِ تقدیر الٰہی کو نہ پوچھ — حسنِ تدبیر نہ رسوا ہو جائے

یعنی اگر تقدیر کی حقیقت ظاہر ہو جائے تو تمام دنیا عمل سے ہاتھ اٹھا لے تقدیر جب تک راز میں ہے تدبیر کی کشش باقی ہے ۔

جب میں نے دعاؤں کا رخ سوئے فلک دیکھا — تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی
کام اب اس تدبیر پر ہے منحصر — واسطہ جس کو نہ ہو تقدیر سے
دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو — اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

۳۔ گناہ و بخشش : ـــــ یہی خیالات ہیں جن سے گناہ کا دروازہ کھلتا ہے۔ مگر فانی نے دوسروں کے برخلاف سرکشی و گناہ پر اصرار اور ذات باری سے گستاخی کی راہ کبھی اختیار نہیں کی۔ بلکہ بخشش کے لیے ایسے ایسے پہلو ڈھونڈھے کہ بعید نہیں جو رحمت کو بھی جوش آجائے ۔

کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ — یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے
امید عفو ہے ترے انصاف سے مجھے — شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا
تیری قدرت کا نظارہ ہے مرا عجز گناہ — تیری رحمت کا اشارہ ہے ندامت میری
اللہ اللہ وہ رحمت ہے خطاکاروں پر — جو خطا ہونے سے پہلے ہی خطا پوش ہوئی
اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ — اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم۔ خدا بھی ہے

یہ مسلّم ہے کہ ایک شاعر اور اچھے شاعر کے یہاں اسلوب یا اسٹائل خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اسٹائل ہی اس کی شخصیت کا بھرپور اظہار ہے اور وہی اس کی شخصیت کو پہچاننے میں مدد دیتا ہے۔ فانی کا اسٹائل انفرادیت کے ساتھ جو ندرت اور دل آویزی رکھتا ہے وہ اوپر کی مثالوں سے واضح ہوا ہو

گا۔ اس کے علاوہ زبان پر ان کی غیر معمولی قدرت۔ الفاظ و تراکیب کا برمحل استعمال۔ جدید فارسی تراکیب کا اختراع۔ ایسے اوصاف ہیں جنھوں نے نہ صرف ان کی شاعری کی دلکشی بلکہ معنویت کو چار چاند لگا دئے ہیں۔ لیکن اس بحث کا یہاں موقع نہیں ہے۔

ضمیمہ اوّل

فانی کی انفرادیت کہیے یا جدت پسندی کہ انھوں نے زبان و بیان میں نئے راستے تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔ مخصوص تراکیب۔ الفاظ کے مخصوص انداز نے ان کی شاعری میں ایک نیا اور دلپذیر رنگ پیدا کر دیا ہے جو ایک طرف ان کی قدرت بیان کی دلیل ہے اور دوسری طرف وسعت زبان کا ضامن ہمارا ذیل کا مطالعہ ان کی خوبیوں یا خامیوں کی طرف متوجہ کرنا نہیں ہے بلکہ اس جائزہ سے یہ دکھانا مقصود ہے کہ انھوں نے کس طرح کس ترکیب یا لفظ کو استعمال کیا ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل ذکر ہے کہ اس ضمیمہ کی تکمیل میں صفحات کے حوالے کلیات فانی، شہزاد بک ڈپو ترکمان گیٹ دہلی سے دیے گئے ہیں جو اکتوبر ۱۹۶۳ء میں شائع ہوا ہے۔ اس جائزہ میں صرف غزلیات کو شامل کیا گیا ہے۔ اس امر کا افسوس ہے کہ کلیات فانی کے اس ایڈیشن میں صفحات کے نمبر بے ترتیب ہو گئے ہیں اس لیے یہاں کبھی انہی بے ترتیب صفحات کے حوالے دیے جا رہے ہیں حیدر آباد کا مطبوعہ نسخہ بھی اس عیب سے بری نہ تھا

تراکیب	مصرع ہائے غزلیات	صفحہ
(الف)		
آزردۂ آویزش شبنم	آزردۂ آویزش شبنم نہ ہوا تھا	۳۷
آزردۂ وہم مسرت	میں وہ آزردۂ وہم مسرت ہوں معاذ اللہ	۴۸

آزادیٔ بے ہنگام	حیف اس آزادی بے ہنگام کی مجبوریاں	۶۳
آزردۂ فغاں	یہی سہی کہ وہ آزردۂ فغاں نہ ہوا	۷۸
آوارۂ حدود نیاز	دل ہے آوارۂ حدود نیاز	۱۱۷
آغاز جاوداں انجام	عشق آغاز جاوداں انجام	۱۲۹
آزردۂ مشق رفو	رہا ہے چاک دل آزردۂ مشق رفو برسوں	۱۳۸
آہ اثر گداز	اب تو خدا اثر نہ دے آہ اثر گداز میں	۱۴۸
آرزوئے رسوا	شان بے نیازی کو آرزوئے رسوا سے	۲۳۸
آشوب صد جہان تماشا	آشوب صد جہانِ تماشا لیے ہوئے	۲۵۷
اضطراب بہار	سکون خاطر بلبل ہے اضطراب بہار	۴
امتیاز قلب و سنگ	مجھ سے ہر جلوے نے سیکھا امتیاز قلب و سنگ	
ادائے ہر نگہ التفات	ادائے ہر نگہ التفات نے مارا	۴۹
انکار تقاضا	تھا مگر شوق ہی انکار تقاضا اپنا	۷۳
ادب آموز امتحاں	یہ ضبط بھی ادب آموز امتحاں نہ ہوا	۷۸
انتہائے سکوت برہم	انتہائے سکوت برہم کیا	۹۱
انتظار قضائے مبرم	انتظار قضائے مبرم کیا	۹۲
ادا آشنا	ادا کو ادا آشنا چاہتا ہوں	۱۳۳
الزام پرستاری صورت	مجھ پر الزام پرستاری صورت کیا خوب	۲۰۳
اثر بے خودیٔ غم	جنوں سہی اثر بے خودیٔ غم نہ سہی	۲۲۵
اضطراب ناپیدا	اضطراب ناپیدا پھر سکون پیدا سے	۲۳۹
ادائے دعوت نظارہ	ادائے دعوت نظارہ دیدنی ہے کہ وہ	۲۴۶

امتیاز صبر و بے تابی	مٹا ہی چاہتا ہے امتیاز صبر و بے تابی	۲۸۷

(ب)

بے تاب تجلی	حسن بے تاب تجلی ہو اور آنکھیں محروم	۵۳
بے خلش مدعا	لطف حیات بے خلش مدعا کہاں	
بے نیازی آداب التفات	اللہ رے بے نیازی آداب التفات	۳۰۶
بعنوان رنج زیست	تو نے کرم کیا تو بہ عنوان رنج زیست	۳۰۶
بے گانہ اختیار	بے گانہ اختیار ہو جا	۴۲
بے واسطۂ خود نگری	بے واسطۂ خود نگری اپنی طرف دیکھ	۴۴
بزم تحیّر	اٹھ بزم تحیر سے وہ کہتے ہیں ادھر آ	
بہار صد چمنستاں آرزو	بہار صد چمنستاں آرزو بن کر	
بلائے آسمان اضطراب	دل ہے یارب یا بلائے آسمان اضطراب	۱۰۲
بہشت شوق	دھیان تیرا بہشت شوق سہی	۱۱۸
بے کسی ہائے مدعا	بے کسی ہائے مدعا کی قسم	۱۳۰
بے حسی شدت شوق	دلِ مشتاق ہے اور بے حسی شدتِ شوق	۱۶۰
بزم ذوق طلب	خالی ہے بزم ذوق طلب اہل ہوش سے	۲۰۶
بار منت ناخن	نہ بار منت ناخن نہ خطرۂ سوزن	۲۲۵
بہ اندازۂ تبسم برق	کرم کیا تو بہ اندازۂ تبسم برق	۲۴۶
بقدر فرصت تمہید شوق	زلیست بقی فانی بقدر فرصت تمہید شوق	۲۹۰

(پ)

پے در پے آفت	آغوش فنا میں ہم پے در پے آفت ہیں	۱۸

پرستارِ شبِ ہجر	اک عمر پرستارِ شبِ ہجر رہا تھا	۴۴
پاسِ وضعِ غم	کیوں پاسِ وضعِ غم تجھے غیرت نہیں رہی	۲۰۹
پردہ نشینِ رنگ و بو	گل پردہ نشینِ رنگ و بو ہے۔	

(ت)

تابِ رنجِ زیست	وہ بدگماں کہ مجھے تابِ رنجِ زیست نہیں	۲
تنکا بضاعتیِ غم	نافی تنکا بضاعتیِ غم کا کیا علاج	
تمہیدِ صد ہزار قیامت	تمہیدِ صد ہزار قیامت ہے ہر نفس	۵۲
تہمتِ نظارۂ جمال	اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارۂ جمال	
تجلیاتِ وہم	تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل	۵۵
توفیقِ اضطراب	توفیقِ اضطراب کرایماں بنا دیا	۷۱
تابِ دل نوازیِ درماں	جو تابِ دل نوازیِ درماں نہ لا سکے	
توفیقِ مدعا	دل کو توفیقِ مدعا ہی نہیں	۱۷۰
توفیقِ گنہ گاری	اللہ رے کرم ہم اور توفیقِ گنہ گاری	
تصویرِ گردِ بادِ فنا	تصویرِ گردِ بادِ فنا ہوں مٹی ہوئی	۲۰۱
تکلیفِ پردہ داریِ حسرت	تکلیفِ پردہ داریِ حسرت نہیں رہی	۲۰۹
تابِ نظارۂ جلال	تابِ نظارۂ جلال حشر میں بخش کر مجھے	۲۱۸
تعمیرِ حسنِ سجدہ ریز	حاصلِ خلقت ہے تعمیرِ جبیں سجدہ ریز	۲۸۲

(ث)

ثباتِ زندگیِ بے ثبات	ثباتِ زندگیِ بے ثبات نے مارا	۴۹

(ج)

جلوۂ آتش پنہاں	جلوہ آتش پنہاں جسے غم کہتے ہیں	۴۸
جلوۂ طاقت ربا	کسی کے جلوۂ طاقت ربا کو کیا دیکھوں	۴۹
جمال مطلق بے نام	جمال مطلق بے نام کی رہائی ہے	۴۹
جلوۂ نظارہ ساز	منھ دیکھتا ہوں جلوۂ نظارہ ساز کا	
جواب بے سوال	جواب بے سوال ہوں سوال بے جواب کا	۵۵
جنون شکوہ بے داد	جنون شکوۂ بے داد پر خدا کی مار	۵۵
جبر کل	بخش دے جبر کل کے صدقے میں	۵۸
جلوہ گہ کیف صد بہار	ہر ورق گل کو جلوہ گہ کیف صد بہار	۸۹
جستجوئے نشاط مبہم	جستجوئے نشاط مبہم کیا	۹۲
جولاں گہہ برق فنا	سینۂ فانی ہے یا جولاں گہہ برق فنا	
جلوۂ جلوہ ساز	جلوۂ جلوہ ساز ہیں ہم لوگ	۱۲۵
جاوداں بے آغاز	حسن ہے جاوداں بے آغاز	۱۲۹
جنون چارۂ وحشت	جنون چارۂ وحشت مگر نہیں ہے مجھے	۲۲۵
جبر دست	محشر میں جبر دست سے طالب ہوں داد کا	۲۵۵

(چ)

چراغ کشتۂ آرام گاہ بے نشانی	چراغ کشتۂ آرام گاہ بے نشانی ہوں	۱۳۲
چشم و چراغ جنوں	کل تک جو ہاتھ چشم و چراغ جنوں رہا	۱۳۸
چرخ بے پروا خرام	ہوشیار اے چرخ بے پروا خرام	۲۳۸
چشم سر بسر تسخیر	دو چشم سر بسر تسخیر کا فر ہوتی جاتی ہے	۲۸۶

فانی بدایونی کی موت پر فراق کے یہ الفاظ ایک ادبی دستاویز ہیں۔

ہندستان کی بدلتی ہوئی زندگی اور شاعری کی طرف سے اسے تصویرِ غم و مصورِ الم۔ اے لاثانی فن کار۔ اے ہماری تہذیب کے انسانی شرافت کے۔ ہمارے دکھ درد کے نمائندے۔ اے دردِ زندگی کے مترنم ساز۔ اے بسمش نکلے۔ نکامش ترنمے۔ اے انسانی زندگی کی مجبوریوں اور کمزوریوں کو اپنے آنسوؤں سے سینچ کر پاک بنا دینے والے۔ اے نازِ حیات۔ ہماری ڈبڈبائی آنکھوں کا سلام لے۔ تو ہماری دنیا میں تھا۔ تو کیا گیا کہ ع

دنیا گذر گئی غمِ دنیا لیے ہوئے[1]"۔

فانی کے ذہنی ارتقا کو سمجھنے کے لیے ان کی زندگی اور سیرت کے مختلف گوشوں کو نمایاں کرنا ضروری ہے جن کے بغیر یہ تصویر نامکمل رہے گی۔ ایک بڑے فن کار کی افتادِ طبع اس کی زندگی اور آرٹ پر حاوی ہوتی ہے۔ ہر فرد کو خدا نے ایک مخصوص قسم کا مزاج عطا کیا ہے۔ اور اسی اندازِ نظر سے ہر محفل میں پہچانا جا سکتا ہے کسی کا مزاج شعر و نغمہ کا خوگر ہے اور کوئی طبعاً سائنس اور فلسفہ کی طرف مائل ہے۔ اسی طرح کوئی شاعر اپنے ماحول میں نشاط و شادمانی کے سامان دیکھتا ہے مگر اپنی غم پسندی کے باعث عیش کے نغمے گا نہیں سکتا اس کے برخلاف دوسرے ایسے شعرا بھی تھے جن کو غم و الم سے سابقہ رہا مگر انھوں نے ہر غم کو قہقہوں میں اڑا دیا۔ زندگی دونوں کے یہاں موجود تھی مگر مزاجوں کے اختلاف نے زندگی کے رخ بدل دیے۔ کسی بھی شاعر کی سیرت کی سب سے بڑی سند اس کا کلام اور اس کے ہم عصروں کی شہادت ہوتی

---

[1] فانی بدایونی۔ فراق گورکھپوری۔ علی گڑھ میگزین فانی نمبر

(ح)

حسرت زدۂ نوش	میں تری بزم میں حسرت زدہ نوش نہ تھا	
حدِ امکانِ تمنّا	جا در حدِ امکانِ تمنا سے گذر جا	۴۵
حائل آثارِ جنوں	چشمِ تر حائل آثارِ جنوں ہے فانی	۴۵
حسن جلوہ ساز	عشق بن گیا آخر حسن جلوہ سازاں کا	۴۹
حریف زوالِ غم	دم ۔ حریف زوالِ غم نہ ہوا	۷۹
حسن عتابِ یار	فانی اب اپنی زندگی حسنِ عتابِ یار ہے	۹۱
حیات مرگ نواز	تونے بخشی حیات مرگ نواز	۱۱۸
حرفِ داستانِ انجام	حالِ دل حرفِ داستانِ انجام	۱۲۹
حرفِ بے معنی فنا	حرفِ بے معنی فنا کی قسم	۱۳۱
حوصلۂ ذوقِ تماشا	پست کر حوصلۂ ذوقِ تماشا کہ ہنوز	۱۳۷
حریف زوالِ غم	دل حریفِ زوالِ غم نہ ہوا	۱۴۰
حسرتِ تاثیرِ درد	ہاں نہیں شرطِ مروت حسرتِ تاثیرِ درد	۱۴۲
حسن جفا پسند	حسن جفا پسند سے حسرت عرضِ شوق کیا	۱۴۴
حسرتِ عرضِ شوق	حسن جفا پسند سے حسرت عرضِ شوق کیا	۱۴۴
حریف گریۂ بے اختیار	حریف گریۂ بے اختیار ہم بھی ہیں	۱۵۳
حسابِ حسرتِ جرمِ نظارہ	حسابِ حسرتِ جرمِ نظارہ دل سے پوچھ	۲۰۲
حاصلِ بے خبری	حاصلِ بے خبری، لازمۂ ہوش ہوئی	۲۰۳
حوصلہ دعائے وصل	فرصتِ یک نظر کے بعد حوصلہ دعائے وصل	۲۱۴
حسن بے تماشا	اکتسابِ غم کرو یوں حسنِ بے تماشا سے	۲۳۸

	فانی کی شاعری	۱۹۵
حریفِ تجلّی	یہ دل حریفِ تجلی ہی کیوں بنایا تھا	۲۴۶
حجابِ زعمِ تماشا	حجابِ زعمِ تماشا اٹھا تو کچھ دیکھوں	۲۶۲
حسن تماشا ریز	یاں نقاب جلوہ خود حسن تماشا ریز ہے	۲۷۲
حسن ستم نواز	حسن ستم نواز کی ایک نگاہ غم نواز	۲۷۳
حریفِ سوزِ نہاں	حریفِ سوزِ نہاں تو نہیں مگر پھر بھی	۲۷۷
حسرتی موت	مایوس سہی حسرتی موت ہوں فانی	۲۷۸
	(خ)	
خاطرِ حسرت نواز	مارا ہوا ہوں خاطرِ حسرت نواز کا	۵۳
خوابِ محرومی	خدا دشمن کو بھی یہ خوابِ محرومی نہ دکھلائے	۶۹
خوابِ زلیخائے محبت	افسانہ مرا خوابِ زلیخائے محبت	
خلوص ربطِ مرگ و عشق	خلوص ربطِ مرگ و عشق میں کچھ شک نہیں لیکن	۱۳۲
خستہ امید باطل	نہ چھیڑ اے نامرادی خستہ امید باطل ہوں	۱۳۸
خرابِ لذتِ دیدارِ یار	خرابِ لذتِ دیدارِ یار ہم بھی ہوں	۱۵۳
خلعتِ مختاری	مجبوریٔ عریاں کو یہ خلعتِ مختاری	۱۸۷
خرابِ لذتِ جاں کاہیٔ محبت	خرابِ لذتِ جاں کاہیٔ محبت ہوں	۲۲۵
خارستانِ حسرت	غبارِ رشکِ خارستانِ حسرت یاس کے منظر	۲۶۱
خوابِ آغوشِ تفس	خوابِ آغوشِ تفس میں آشیاں دیکھا کیجئے	۲۸۹
	(د)	
دشواریٔ انکار	دشواریٔ انکار سے طالب نہیں ڈرتے	۱
دیارِ عمر	دیارِ عمر میں اب قحط مہر ہے فانی	۳

دل وفا خراب	مآل پوچھتا ہوں میں دل وفا خراب کا	۵۵
دل اذیت آفریں	دل اذیت آفریں رہین امتحاں نہیں	۵۵
در زندان تمنا	بے فائدہ کھولا در زندان تمنا	۷۰
دوزخ راز	دل عاشق ہے ایک دوزخ راز	۱۱۸
دست بردو رنگ	میری موت اور یہ دست بردو رنگ	۱۲۴
درخور انعام جفا	درخور انعام جفا اور رقیب	۱۲۷
داد مظلوم نگاہی	داد مظلوم نگاہی بھی تو لے لینے دے	۱۴۱
دریوزۂ فنا	دریوزۂ فنا مرے مسلک میں ہے حرام	۲۳۵
داد خودنمائی	داد خودنمائی لے وحدت تمنا سے	۲۳۸
دعوت سعی نظر	ہر آئینہ ہے دعوت سعی نظر مجھے	۲۵۷
(ر)		
رفتہ بیم خزاں	رفتۂ بیم خزاں تھی اس چمن کی ہر بہار	۳۹
رہ بے منزل دل	یہ نقش قدم ہیں رہ بے منزل دل میں	۴۵
راز فریب غم و راحت	کھول دے راز فریب غم و راحت نہ کہیں	۴۹
رفتہ نظر	رفتۂ نظر ہو جا سب سے بے خبر ہو جا	۵۵
رونمائے جوش حیرت	رونمائے جوش حیرت تھی نگاہ	۹۳
روداد عبرت خیز عشق قیس	روئیں کیا روداد عبرت خیز عشق قیس پر	۹۴
راز داران اضطراب	ہو چلی ہیں وہ نگاہیں راز داران اضطراب	۱۰۱
رخصت تلقین صبر	پہلے اجل کو رخصت تلقین صبر دے	۱۲۱
راز ناکامئ وفا	راز ناکامئ وفا کی قسم	۱۳۰

رویائے پریشان فنا	میں رویائے پریشان فنا ہوں یعنی فانی ہوں	۱۳۲
رفتہ آشوب ہوش	عہد خزاں میں رفتہ آشوب ہوش ہوں	۱۵۱
روشناس آگہی	کسی کو دیکھ کر دل روشناس آگہی کیوں ہو	۱۷۳
روشناس اجابت	کہ روشناس اجابت نہیں دعا میری	۱۸۷
	(ز)	
زبان دان تمنا	باقی نہ رہا کوئی زبان دان تمنا	۷۰
	(س)	
سازانا لیلیٰ	پھر تو مضراب جنوں، سازانا لیلیٰ چھیڑ	۴۰
سوختہ سامان تمنا	اک دل ہے سو ہے سوختہ سامان تمنا	۷۱
سکوت بے جا	ہر سکوت بے جا کی نہ میں تھا بیاں اپنا	۷۵
سجدۂ راہ گزر	سجدۂ راہ گزر یاد آیا	۸۳
ستم رسیدۂ آوازۂ بیاں	ستم رسیدۂ آوازۂ بیاں ہوں میں	۱۰۶
سلسلہ برہم ہوش	کچھ نہ تھا ورنہ بجز سلسلۂ برہم ہوش	۱۳۰
سحر سازی ادراک	دل ہے اور سحر سازی ادراک	۱۲۴
سعی نامعلوم	مرے نصیب میں تھی ورنہ سعی نامعلوم	۱۲۹
سعیٔ اظہار ماجرا	سعیٔ اظہار ماجرا کی قسم	۱۳۱
ستم ہائے شوق آزما	ستم ہائے شوق آزما چاہتا ہوں	۱۲۵
سرمۂ تقاضا آنکھیں	ہائے دنیا دہ تری سرمۂ تقاضا آنکھیں	۱۵۹
سجدہ بے جبیں	خاک جبیں سے کام لے سجدہ بے جبیں سہی	۲۱۱
ستم کدہ تمنا	بخشا گیا ستم کدۂ تمنا مجھے	۲۲۶

سلسلۂ قید حیات	مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات	۲۸۵
سعیٔ عرض محبت	ننگ ہے سعیٔ عرض محبت، فرض محبت پورا کر	۲۴۸

(ش)

شعلہ بے ہوش	ورنہ پہلے سوز غم اک شعلہ بے ہوش تھا	۶
شکوہ طراز تپ ہجر	دل مشتاق نہ تھا شکوہ طراز تپ ہجر	۳۵
شعلۂ عریاں	دل ہوا بجھ کے وہی شعلۂ عریاں میرا	۴۰
شکست رنگ رخ کائنات	شکست رنگ رخ کائنات نے مارا	۴۹
شعلہ زار نور	فضائے شوق کا وہ شعلہ زار نور ہو جانا	۶۹
شہید کشمکش صبر و اضطراب	شہید کشمکش صبر و اضطراب ہوا	۸۰
شکوہ طاقت ربائی ہائے غم	شکوہ طاقت ربائی ہائے غم کیا کیجئے	۹۴
شہید غم آرزو	لاؤ اسے شہید غم آرزو کریں	۱۴۳
شرح دراز زندگیٔ مختصر	شرح دراز زندگیٔ مختصر کو میں	۱۵۱
شرمندۂ آواز	نغمے ہیں جو شرمندۂ آواز نہیں ہیں	۱۵۷
شکوہ غارت گری ہائے تغافل	شکوہ غارت گری ہائے تغافل کیا کریں	۱۶۸
شعلہ پناہی	آہ کی شعلہ پناہی کو نہ پوچھ	۱۸۰
شہید تبسم	خزاں شہید تبسم ہوئی، بہار ہوئی	۱۰۳
شب بے صبح	وہ گھڑی بھی شب بے صبح تجھے یاد ہے جب	۲۰۳
شکایت گلہ بے اثر	شکایت گلہ بے اثر نہیں ہے مجھے	۲۲۵
شیون جوش	ذرہ ذرہ تربت فانی کا شیون جوش تھا	۲۷۴
شعلۂ خس پوش	بے تکلف ہر نفس اک شعلۂ خس پوش ہے	۲۷۴

شعلہ زار سوز فرقت	جاں فزا ہے شعلہ زار سوز فرقت کی بہار	۲۸۲

(ص)

صرف کشمکش ہائے تماشا	وہ بھی صرف کشمکش ہائے تماشا ہو گیا	۹۴
صلائے عیش مدام	یہ نوید گردش جام کیا یہ صلائے عیش مدام کیا	۱۱۰
صرف کشمکش جستجو	کیوں دل کو صرف کشمکش جستجو کریں	۱۴۳
صورت گر آغوش	خود تری یاد ہی صورت گر آغوش ہوئی	۲۰۳
صورت کدۂ جاں	حرف صد رنس ہی صورت کدۂ جاں کوئی	۲۰۷

(ط)

طوفان اضطراب جنوں	طوفانِ اضطراب جنوں اٹھ کے دیر سے	۲۵۴
طلسم شوق یاس آمیز	ٹوٹ کر بھی دل طلسم شوق یاس آمیز ہے	۲۷۲
طلسم فیض	اک طلسم فیض ہے سینے میں سوزِ دل کی ذات	۲۷۴

(ع)

عبرت سرائے دل	عبرت سرائے دل میں ہوں آوازِ دور باش	۵۲
عذر بے تقصیر	کیا مزے کا ہے تقاضا عذر بے تقصیر کا	۵۳
عالم امکان تمنا	دنیا ہے مری عالم امکان تمنا	۶۹
عقل کج فہم	عقل کج فہم نے دیوانہ بنانا چاہا	۸۰
عزیز خاطر نامہرباں	عزیز خاطرِ نامہرباں سخت جانی ہوں	۱۳۲
عہد دل فریبی تاثیر	وہ عہد دل فریبی تاثیر اب کہاں	۲۰۹
عیش غم انجام	ہم مفت بھی یہ عیش غم انجام نہ لیتے	۲۲۳
عشرت تجلی	عشرت تجلی کی لذتیں ذرا ٹھہریں	۲۳۸

عشق کار فرما	کام آپڑا آخر فانی عشق کار فرما سے	۲۲۹
عقلِ غم فروش فراغت نما	اے عقلِ غم فروش فراغت نما ٹھہر	۲۵۴
عیشِ خوابِ لحد	اندیشۂ عیشِ خوابِ لحد کا نہ کیجیے	۲۸۸

(غ)

غم حوصلہ فرسا	چشم بد دور غم حوصلہ فرسا اپنا	۴۷
غم ہستی جاوید	ہو غم ہستیٔ جاوید گوارا کیونکر	۱۳۸
غم کدۂ عمر دوش	دل ہے وہ طاق غم کدۂ عمر دوش کا	
غبار تمنا	وہ پیرہن غبار تمنا کہیں جسے	
غبار رشک	غبار رشک خارستان حسرت یاس کے منظر	

(ف)

فتنۂ ہر لب و آوازۂ ہر گوش	فتنۂ ہر لب و آوازۂ ہر گوش نہ تھا	
فرصت رنج اسیری	فرصت رنج اسیری دی نہ ان دھڑکوں نے ہائے	۶۱
فال افزونی مشکل	فال افزونی مشکل ہے ہر آسانی کار	۶۷
فریب سادگی	پھر فریب سادگی ہے رہنمائے کوئے دوست	۱۰۲
فریب گردش رنگ	آنکھ ہے اور فریب گردش رنگ	۱۲۴
فیض یک لمحہ دیدار	فیض یک لمحہ دیدار سلامت فانی	۱۸۶
فنا آباد غم	ہے فنا آباد غم اک معنیٔ لفظ آفریں	۲۷۳

(ق)

قید آداب تماشا	قید آداب تماشا بھی تو محفل سے اٹھا	۱۶
قبر بے نشاں انجام	وہ ہے اک قبر بے نشاں انجام	۱۲۹

	فانی کی شاعری	۲۰۱
قیامت آل	صدقے اس ابتدائے قیامت آل کے	۲۴۱
	(ک)	
کیفیتِ نگاہِ سرور آفریں	کیفیت نگاہ سرور آفریں نہ پوچھ	۸۹
کشتیٔ اعتبار	کشتیٔ اعتبار توڑ کے دیکھ	۱۷۰
کم مایۂ غم	خلش درد سے کم مایۂ غم ہیں محروم	۲۲۸
کفرِ غم ہوش	حد، کفرِ غم ہوش کی ایماں سے ملا دے	۲۳۰
کیفیتِ ظہورِ فنا	کیفیتِ ظہورِ فنا کے سوا نہیں	۲۳۵
	(گ)	
گریۂ حیراں	خندۂ عیش پہ یہ گریۂ حیراں میرا	۴۹
گرم تلافی	آسماں گرم تلافی چاہیئے کیا نفس	۶۲
گدائے اثر	دعا گدائے اثر ہے گدا پہ تکیہ نہ کر	۶۴
گرم روی ہائے شوق	کیا کہیئے اپنی گرم روی ہائے شوق کو	۹۴
گریۂ ساماں	ہر تبسم کو چمن میں گریۂ ساماں دیکھ کر	۱۱۳
گم شدگانِ رہ غم	گم شدگانِ رہ غم کی مثال	۱۲۷
گریۂ محرومیٔ دیدار	بے ادب گریۂ محرومیٔ دیدار نہیں	۱۵۹
گوشہ گیر حلقۂ زنجیر	پھر گوشہ گیر حلقۂ زنجیر ہے جنوں	۲۵۴
گلہ مند جفا	گلہ مند جفا تو ہو فانی	۲۶۴
	(ل)	
لطف سعیٔ عمل	لطف سعیٔ عمل اس مطلب حاصل سے اٹھا	
لذت کش آرزو	لذت کش آرزو ہوں فانی	۱۳۵

لب زیرِ تموج	لب زیرِ تموج تھا اک اک خطِ پیمانہ	۱۸۴

(م)

محشرِ سکوت	برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشرِ سکوت	۴
منعقد حشرِ مجسم	میں منعقدِ حشرِ مجسم نہ ہوا تھا	۳۸
محرومِ مرگِ ناگہاں	یوں نہ تھے محرومِ مرگِ ناگہاں بیمارِ عشق	۳۸
مضرابِ جنوں	پھر تو مضرابِ جنوں سازِ انا لیلیٰ نہ چھیڑ	۴۰
مطلبِ حاصل	لطفِ سعیِ عمل اس مطلبِ حاصل سے اٹھا	۴۱
ماتم کدۂ وفا	ماتم کدۂ وفا ہے عالم	۴۲
مجبورِ یک نظر	مجبورِ یک نظر آ۔ مختارِ صد نظر جا	۴۳
عتابِ صد نظر	مجبورِ یک نظر آ۔ مختارِ صد نظر جا	۴۳
مرحلۂ سعیِ تماشا	اس مرحلۂ سعیِ تماشا سے گذر جا	۴۵
من جملۂ آدابِ غم خواری	مگر من جملۂ آدابِ غم خواری ہے غم میرا	۴۷
مئے میناگداز	لا جامِ ساقیا مئے میناگداز کا	۵۳
مشاہداتِ آب و گل	تجلیاتِ وہم ہیں مشاہداتِ آب و گل	۵۵
مرگِ کامیاب	کہاں سے لاؤں اعتبارِ مرگِ کامیاب کا	۵۵
مذاقِ تلخ پسندی	مذاقِ تلخ پسندی نہ پوچھ اس دل کا	۶۴
محرومِ مدعائے حیات	مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات	۶۴
معرکۂ ناوکِ ناز	ہائے وہ معرکۂ ناوکِ ناز	۸۳
محوِ فروغِ ذات	محوِ فروغِ ذات ہوں بے خبر صفات ہوں	۹۰
محشرِ بے خودی	دل محشرِ بے خودی ہے اللہ اللہ	۱۰۶

	خانی کی شاعری	۲۰۳
متاعِ یک جہانِ آرزو	متاعِ یک جہانِ آرزو جو چند گھڑیاں نہیں	۱۰۸
مشق حیلۂ پرداز	پرہیں اور مشق حیلۂ پرداز	۱۱۸
مایۂ عرفانِ خودی	بے خودی مایۂ عرفانِ خودی ہے جینی	۱۲۰
مرکزِ ہنگامۂ ہوش از رم ہوش	میں ہوں اک مرکزِ ہنگامۂ ہوش از رم ہوش	۱۲۰
مرگ ناگہاں انجام	عشق تھا مرگ ناگہاں انجام	۱۲۹
ماتم زادِ مرگ ناگہانی	اب اک مدت سے ماتم زادِ مرگ ناگہانی ہوں	۱۲۳
مدہوش تماشا	محو تماشا ہوں میں یارب یا مدہوش تماشا ہوں	۱۲۳
مدعا آشنا	زباں مدعا آشنا چاہتا ہوں	۱۲۳
مے بے سبو	چل کر چمن میں شغل مے بے سبو کریں	۱۴۳
منت پذیرِ ہمدمیٔ دوستاں	منت پذیرِ ہمدمیٔ دوستاں نہیں	۱۴۶
مختارِ انفعال	گھٹتا ہے جی کہ ہم نہیں مختارِ انفعال	۱۵۰
موسمِ دیوانہ گر	بھولا ہوا ہوں موسمِ دیوانہ گر کو میں	۱۵۰
مستیٔ عیش خمار	خرابِ مستیٔ عیش خمار ہم بھی ہیں	۱۵۱
محرومِ صد تماشا	نظر ہی ہے جو محرومِ صد تماشا ہو	۱۶۱
ماکِ سوزِ غم ہائے نہانی	ماکِ سوزِ غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ	۱۷۴
مجبوریٔ عریاں	مجبوریٔ عریاں کو یہ خلعتِ مختاری	۱۸۷
مجبوریٔ مشکور	مجبوریٔ مشکور کی تصویر دکھادے	۲۳۰
مجبور تماشائے سراب	کوئی مجبور تماشائے سراب آتا ہے	۲۶۳
مشق خوئے تغافل	نہ مشق خوئے تغافل پھر ایک بار رہے	۲۶۸
معنی لفظ آفریں	ہر ننا آبادِ غم اک معنیِ لفظ آفریں	۲۷۲

فہرست

۱۔ پیش گفت	۵
۲۔ دیباچۂ ثانی	۹
۳۔ فانی کا ماحول اور شخصیت	۱۱
۴۔ فلسفۂ غم۔ اس کی ماہیت اور اہمیت	۳۱
۵۔ فانیؔ کا غم اور عشق	۵۳
۶۔ فانی کا تصوف	۷۵
۷۔ فانیؔ کی اخلاقی شاعری	۹۵
۸۔ میر غالب اور فانی	۱۰۷
۹۔ فانی اور معترضین	۱۳۷
۱۰ اردو غزل میں فانیؔ کا مقام	۱۶۵
ضمیمۂ اوّل	۱۸۹
ضمیمۂ دوم	۲۰۷
۱۱۔ انتخاب کلیات فانیؔ	۲۱۱

ہے۔ جن سے اس کی زندگی کا ہر گوشہ بے نقاب ہوتا ہے۔ آیئے ان دونوں اسناد کی روشنی میں فانی کی سیرت کا جائزہ لیں۔

فانی ایک خود دار اور عالی ظرف انسان تھے۔ اور سچ پوچھیئے تو اسی خودداری کے باعث وہ زندگی میں ترقی نہ کر سکے۔ انھوں نے دولت کو اس وقت ٹھکرا دیا جب ان کو اس کی سخت ضرورت تھی۔ ایک جگہ وہ خود کہتے ہیں۔

"جو شعرا صحیح معنی میں شعرا تھے یا ہیں۔ وہ شعر کو اس کے صحیح درجہ سے گرانے کے لیے نہ کسی قیمت سے خریدے جا سکتے ہیں۔ اور نہ کسی قوت سے مرعوب ہو سکتے ہیں۔ وہ ہر مصیبت کو جو اس مسلک کی بدولت ان پر ٹوٹتی ہے خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے ہیں اور برداشت کرتے رہیں گے"[1]

ان کے کلام میں بھی اس قسم کے دلچسپ اشارے مل جاتے ہیں۔

اس بحر بیکراں میں ساحل کی جستجو کیا کشتی کی آرزو کیا۔ ڈوب اور پار کر جا
ننگ ہے سعیِ عرضِ محبت، فرضِ محبت پورا کر

اس کے سوا کچھ یاد نہ رکھ بھولے سے اثر کا نام نہ لے
دل کے سوا یہاں کوئی محرمِ درد دل نہیں بے خبروں سے کیوں کہیں اہلِ خبر سے کیا کہیں

اس وقت جب کہ دنیا والوں کی نگاہیں فطرتاً ناخدا پر ہوتی ہیں۔ فانی کی غیرت لنگر اور ناخدا دونوں سے بے نیاز تھی۔ ان کو خدا کے بعد اپنے دست و بازو پر ناز تھا

لنگر کا آسرا ہے نہ تائیدِ ناخدا میرے سپرد ہے مری کشتی خدا کے بعد

یہ کوئی شاعرانہ تخیل نہیں بلکہ فانی کی زندگی کا سچا مرقع ہے۔ ان کا حال کبھی مفت کش زبان نہ ہوا۔ وہ خود ہی، تجلی بنتے ہیں اور خود ہی پروانہ، وہ اپنے عزم

---

[1] شعر و شاعری فانی۔ سب رس ریڈیو نمبر جنوری ۱۹۴۱ء

مایہ ادراک ہستی	مایۂ ادراک ہستی تو تکلف برطرف	۲۷۳
منت کش بیدادیٔ صیاد	منت کش بیدادیٔ صیاد نہیں ہے	۲۷۶
مژدۂ جنت وصال	مژدۂ جنت وصال ہے موت	۲۸۳
محشر جدائی	زندگی محشر جدائی ہے	۲۸۳
مجبور خاموشی	کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبور خاموشی کا ہائے	۲۹۰

(ن)

نگاہ خودشناس	مرا وجود ہے میری نگاہ خودشناس	۳
نور برق معرفت	نور برق معرفت بخشا دل آگاہ نے	۶
نگہ آخر بے رنگ	بھرنے نگہ آخر بے رنگ میں ہر رنگ	۴۴
نشۂ دیوانگیٔ ہوش	اے نشۂ دیوانگیٔ ہوش اُتر جا	۴۴
نامراد اجل	وہ نامراد اجل بزم یاس میں بھی نہیں	۶۵
ناسازگاریٔ غم	اور ناسازگاریٔ غم کیا	۹۲
نقش موہوم حیات	نقش موہوم حیات افسانہ در افسانہ تھا	۱۰۰
نوید گردش جام	یہ نوید گردش جام کیا۔ یہ صلائے عیش مدام کیا	۱۱۰
نیرنگ نام عیش	ٹوٹا ہے میرے عہد میں نیرنگ نام عیش	۱۱۹
ناواقف رسم جہان کامرانی	ابھی ناواقف رسم جہان کامرانی ہوں	۱۳۳
نمک پاش جراحت ہائے دل	کون تھا یارب نمک پاش جراحت ہائے دل	۱۶۸
نوید ربط	نوید ربط ہے ہر جور لیکن	۱۹۵
نقطۂ موہوم اتصال	فانی میں ہوں وہ نقطۂ موہوم اتصال	۲۰۲
نوید زندگیٔ دل	نوید زندگیٔ دل کی تاب سہل نہیں	۲۲۹

نقادِ سوزِ دل	کیوں اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل	۲۵۵
نشاطِ آشکار	نشاطِ آشکار ہے غم نہاں لیے ہوئے	۲۵۶
نویدِ صد شکست	دلیلِ فتحِ عاشقی نویدِ صد شکست ہے	۲۵۶
نگہِ ماسوا نگر	اٹھا بھی دے نگہِ ماسوا نگر کا حجاب	۲۶۰
نیرنگِ تقاضائے نگاہ	جلوہ رنگ ہے نیرنگِ تقاضائے نگاہ	۲۶۲
نشاطِ جنوں	باقی نہیں کسی کو نشاطِ جنوں کا ہوش	۲۷۰
نگاہِ غم نواز	حسنِ ستم نواز کی ایک نگاہِ غم نواز	۲۷۳

(و)

وسعتِ صد عالمِ صحرا	ذرّہ میں ہے گم وسعتِ صد عالمِ صحرا	۴۵
وسوسۂ قلب و نظر	کر قطع نظر وسوسۂ قلب و نظر سے	۴۵
وضعِ خود پسندی	اے حسن یہ وضعِ خود پسندی کب تک	۱۲۳
وضعِ اضطراب	کون سی وضعِ اضطراب میرے قرار میں نہیں	۱۱۹
وضعِ شکستِ عشق	وضعِ شکستِ عشق نبھائے دیکھ کوئی الزام دے	۲۴۰
واسطۂ حسنِ قبول	کیوں رہے بیچ میں یہ واسطۂ حسنِ قبول	۲۴۸
وحدت آشنا	شوقِ وحدت آشنا بیگانۂ آغوش ہے	۲۷۴

(ہ)

ہجومِ ناز	سرِ ہوش برق گری وہ ہجومِ ناز ہوتا	۳
ہر جلوہ پوشیدہ و پیدا	ہر جلوۂ پوشیدہ و پیدا سے گزر جا	۴۵
ہلاکِ تلخیٔ تاخیرِ موت	ہلاکِ تلخیٔ تاخیرِ موت ہوں فانی	۴۹
ہمہ گیری نواہی	ہمہ گیری نواہی کو نہ پوچھ	۸۰

ہوسِ کوشی	جینا ہے ہوس کوشی، مرنا ہے ریاکاری	۱۸۸
ہوائے سلسلۂ جنبانیٔ نشاط	دل اور ہوائے سلسلۂ جنبانیٔ نشاط	۲۰۹
ہلاک تلخیٔ تاثیرِ شکوہ	ہلاک تلخیٔ تاثیرِ شکوہ ہوں فانی	۲۲۷
ہدیۂ مژگاں	ناموسِ عشق ہدیۂ مژگاں کیے ہوئے	۲۵۴

(ی)

یوسف کنعان تمنا	جلوہ ہی ترا یوسفِ کنعان تمنا	۷۰
یادگارِ ناوکِ ناز	یہ دل ہے یادگارِ ناوکِ ناز	۱۹۴

ضمیمہ دوم

کتابیات

۱۔ شعر العجم — شبلی
۲۔ اردو شاعری پر ایک نظر — کلیم الدین احمد
۳۔ جدید اردو شاعری — عبدالقادر سروری
۴۔ دورِ حاضر اور اردو غزل — عندلیب شادانی
۵۔ ہماری شاعری — مسعود حسن رضوی
۶۔ اردو شاعری میں تصوف — اعجاز حسین
۷۔ نقدِ سخن — عزیز جنگ
۸۔ کلاسکی ادب — خواجہ احمد فاروقی
۹۔ تنقیدی اشارے — آل احمد سرور
۱۰۔ شوپنہاور — مجنوں گورکھپوری
۱۱۔ مباحث و مسائل — ضیاء احمد بدایونی
۱۲۔ فانی — دیبی پرشاد
۱۳۔ فانی — مرتبہ عبدالشکور
۱۴۔ فانی — کبیر احمد جائسی

۱۵۔ فانی بدایونی — مغنی تبسم
۱۶۔ شعر العجم — شبلی
۱۷۔ شعر الہند — عبد السلام ندوی
۱۸۔ غزل سرا — مجنوں گورکھپوری
۱۹۔ اردو غزل — یوسف حسین خاں
۲۰۔ غزل و مطالعہ غزل — عبادت بریلوی
۲۱ TITON HISTORY OF PHILOSOPHY
۲۲ J.T. SHELLEY-ENCLP OF LITERATURE
۲۳ DREDLEY- SHAKSPEARIAN TRAGEDY
۱۔ کلیات فانی — فانی بدایونی
۲۔ عرفانیات فانی — " "
۳۔ باقیات فانی — " " (مقدمہ پروفیسر رشید احمد صدیقی)
۴۔ وجدانیات فانی — "
۵۔ انتخاب کلام میر — مرتبہ عبد الحق
۶۔ دیوان درد — مرتبہ ظہیر احمد صدیقی
۷۔ دیوان غالب — مرتبہ مالک رام
۸۔ نشاط روح — اصغر
۹۔ شعلہ طور — جگر
۱۰۔ بانگ درا — اقبال
۱۱۔ پس چہ باید کرد — اقبال

۱۲۔ ارمغان حجاز			اقبال
۱۳۔ ایک خواب اور			سردار جعفری
۱۴۔ آہنگ			مجاز
۱۵۔ فروزاں			جذبی
۱۶۔ دست صبا			فیض
۱۔ علی گڑھ میگزین (فانی نمبر)		۱۹۴۳ء	
۲۔ نگار (انتقاد نمبر)		۱۹ء	
۳۔ نگار اپریل		۱۹۴۹ء	
۴۔ نگار اپریل		۱۹۴۶ء	فانی کی شاعری — ظہیر الدین
۵۔ نگار جنوری		۱۹۴۱ء	فانی بدایونی
۶۔ معارف مارچ		۱۹۴۵ء	باقیات فانی — احسان احمد
۷۔ معارف اپریل		۱۹۴۵ء	عرفانیات فانی — احسان احمد
۸۔ کاروان جلد ۹ نمبر ۱ - ۵ - ۸			فانی — عبد الحئی
۹۔ جامعہ دسمبر		۱۹۴۱ء	فانی کی موت — عبد القیوم
۱۰۔ سب رس جنوری		۱۹۴۱ء	شعر و شاعری — فانی بدایونی
۱۱۔ اردو اکتوبر		۱۹۵۵ء	فانی — خالدہ شوکت
۱۲۔ ادبی دنیا شمارہ ۳		۱۹۵۵ء	فانی اور انکی شاعری — خورشید محمد
۱۳۔ ساقی اکتوبر		۱۹۴۱ء	فانی بدایونی — محمد احمد سبزواری
۱۴۔ ساقی نومبر		۱۹۴۱ء	فانی مرحوم — ماہر القادری
۱۵۔ ساقی مارچ		۱۹۴۲ء	فانی کے کلام میں لکھنوی آرٹ

انتخاب کلیات فانی

فصل گل جو یاد آئی، آشیاں بھی یاد آیا
فصل گل میں اجڑا تھا شاید آشیاں اپنا

بجلیوں سے غربت میں کچھ بھرم تو باقی ہے
جل گیا مکاں یعنی تھا کوئی مکاں اپنا

نقش سجدہ گھس کر کیوں مٹائے دیتے ہو
اس میں کیا نظر آیا سنگ آستاں اپنا

دل مرحوم کو خدا بخشے
ایک ہی غم گسار تھا نہ رہا

موت کا انتظار باقی ہے
آپ کا انتظار تھا نہ رہا

نام بدنام ہے، ناحق شب تنہائی کا
وہ بھی اک رخ ہے، تری انجمن آرائی کا

چل رہا ہے مجھے کچھ وعدۂ فردا کا یقیں
دل پہ الزام نہ آ جائے شکیبائی کا

اب نہ کانٹوں ہی سے کچھ لاگ نہ پھولوں سے لگاؤ
ہم نے دیکھا ہے تماشا تری رعنائی کا

لگ گئی بھیڑ یہ دیوانہ جدھر سے گذرا
ایک عالم کو ہے سودا ترے سودائی کا

پھر اسی کافر بے مہر کے در پر فانی
لے چلا شوق مجھے ناصیہ فرسائی کا

یاد ہے وہ نومیدی میں ہلکی سے جھلک امیدوں کی
ہائے وہ دل کے ویرانے پر دھوکا سا آبادی کا

یاس و امید سے کام نہ نکلا، دل کی تمنا دل میں رہی
ترک تمنا کر نہ سکے اظہار تمنا ہو نہ سکا

جذب دل جب بروئے کار آیا
ہر نفس سے پیام یار آیا

موت کا انتظار تھا آئی
جائیے اب مجھے قرار آیا

جب کسی نے لیا تمہارا نام
گریہ بے قصد و اختیار آیا

بے قراری میں اب یہ ہوش نہیں
کس کے در پر مجھے پکار آیا

لرزش گل پہ پھر بکھار رہی ہے نسیم
آئیے موسم بہار آیا

آج ہم پی سکے نہ وہ آنسو
ان کے آگے جو بار بار آیا

شکوہ منظور نہیں تذکرۂ عشق نہ چھیڑ
کر وہ در پردہ مرا حال پریشاں نکلا

بجلیاں شاخ نشیمن پہ بچھی جاتی ہیں
کیا نشیمن سے کوئی سوختہ ساماں نکلا

اک معمہ ہے سمجھنے کا نہ سمجھانے کا
زندگی کاہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا

حسن ہے ذات مری عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

مختصر قصۂ غم یہ ہے کہ دل رکھتا ہوں
راز کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

زندگی بھی تو پشیماں ہے یہاں لا کے مجھے
ڈھونڈھتی ہے کوئی حیلہ مرے مر جانے کا

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ
آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

اب اسے دار پہ لے جا کے سلا دے ساقی
یوں بہکنا نہیں اچھا ترے مستانے کا

دل سے پہونچی تو ہیں آنکھوں میں لہو کی بوندیں
سلسلہ شیشہ سے ملتا تو ہے پیمانے کا

ہر نفس عمر گزشتہ کی ہے میت فانی
زندگی نام ہے مر مر کے جیئے جانے کا

کسی کے ایک اشارے میں کس کو کیا نہ ملا
بشر کو زیست ملی ۔ موت کو بہانہ ملا

خدا کی دین نہیں ظرف خلق پر موقوف
یہ دل بھی کیا ہے جسے درد کا خزانہ ملا

دلی زباں سے مرا حال چارہ ساز نہ کہہ
بس اب تو زہر ہی دے زہر میں دوا نہ ملا

نشان مہر ہے ہر ذرہ ظرف مہر نہیں
خدا کہاں نہ ملا اور کہیں خدا نہ ملا

مری حیات ہے محرومِ مدعائے حیات
وہ رہ گذر ہوں جسے کوئی نقش پا نہ ملا

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر
کیا یہ ساری عمر منھ تکتی رہیں تقدیر کا

میرے دل سے پوچھتے ہیں آپ کیا وجہ خلش
یاد ہے گم ہو گیا تھا کوئی پیکاں تیر کا

آپ کی آزردگی بے سبب بھی خوب ہے
کیا مزے کا ہے تقاضا عذر بے تقصیر کا

کس نظر سے تم نے دیکھا اپنے دامن کی طرف
کانپ اٹھا ہر ذرہ میری خاک دامن گیر کا

برق کو اب کیا غرض کیا رہ گیا کیا جل گیا
جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا مری تقدیر کا

فکر راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی
ہم نے قسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا

قربان عشق موت بھی آئی تو کیا ہوا
اس تیر بے خطا کا نشانہ خطا ہوا

طوفاں ہی ایک کیا مجھے طوفاں سے کم نہیں
لنگر ہوا سفینہ ہوا ناخدا ہوا

کیوں خون دل لگی ہی رہے گی جگر میں آگ
اے عشق عاشقی تری غیرت کو کیا ہوا

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول
تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

اے جذب بے خودی ترے قربان جایئے
پھرتا ہے دل میں کوئی مجھے ڈھونڈھتا ہوا

سنا ہے اٹھا ہے اک بگولہ جلو میں کچھ آندھیوں کو لے کر
طوافِ دشت جنوں کو شاید گیا ہے فانی غبار میرا

اجل کے زیر اثر ہو وہ نقش ہستی کیا
ہوا کہ برق کے سایے میں آشیاں نہ ہوا

ہر آن فتنہ ہے ہر فتنہ اک قیامت ہے
ترا شباب ہوا، دور آسماں نہ ہوا

ہمیں ابھی ترے اشعار یاد ہیں فانی
ترا نشاں نہ رہا اور بے نشاں نہ ہوا

مجھ کو مرے نصیب نے روز ازل نہ کیا دیا
دولت دو جہاں نہ دی اک دل مبتلا دیا

دل ہی نگاہ ناز کا ایک ادا شناس تھا
جلوۂ برق طور نے طور کو کیوں جلا دیا

اب مری لاش پر حضور موت کو کوستے تو ہیں
آپ کو یہ بھی ہوش ہے کس نے کسے مٹا دیا

دل میں سما کے پھر گئی آس بندھا کے پھر گئی
آج نگاہ دوست نے کعبہ بنا کے ڈھا دیا

اُف کے گناہ گار ہم ہیں تو مگر خطا معاف
آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا

آپ ہم اپنی آگ میں اے غم عشق جل بجھے
آگ لگے اس آگ کو پھونک دیا، جلا دیا

نازک ہے آج شاید حالت مریض غم کی
کیا چارہ گر نے سمجھا کیوں زار زار رویا

فانی کو یا جنوں ہے یا تیری آرزو ہے
کل نام لے کے تیرا دیوانہ وار رویا

کہتا ہے غم یار میں ہوں جان تمنا
دنیا ہے مری عالم امکان تمنا

مضمون تو مکتوب ازل کا نہیں معلوم
لکھا ہے مرے خون سے عنوان تمنا

آہستہ گذر صرصر غم وادیٔ دل میں
برباد نہ کر خاک شہیدان تمنا

ہے یاد تری رونق خلوت گہہ خاطر
ہے ذکر ترا شمع شبستان تمنا

نالے ہیں نہ آہیں، نہ خلش ہے نہ تپش ہے
باقی نہ رہا کوئی زباں دان تمنا

پھر یاس نے رکھا ہے قدم خانۂ دل میں
یعنی ہے اب الوداع مہمان تمنا

کی بدولت، ہر منزل زہر جادہ، سے گذر جاتے ہیں۔ ان کی خود اعتمادی کی شان یہ ہے۔

ہر کلمۂ الحق میں اک کیفِ انا بھر دوں — توبہ سے جو ٹکرا دوں اٹھا ہوا پیمانہ

فانی درباروں میں ہوں یا سرکاروں میں، حسن و عشق کی محفلوں میں ہوں یا کسب معاش کی منزلوں میں جہاں سے گذرے اپنی خودداری کو سنبھالے ہوئے گذرے۔ فانی کے حالات کا بغور مطالعہ کیجئے تو پتہ چلے گا کہ ان کی زندگی اور ماحول میں کوئی انقلاب نہیں ملتا۔ جو کسی شاعر یا فرد کی زندگی میں تہلکہ مچا دیا کرتا ہے جو نشیب و فراز ان کی زندگی میں نظر آتے ہیں۔ ان کی حیثیت سیلاب یا طوفان کی نہیں ہے بلکہ جوار بھاٹا کی سی ہے جو چند لمحات کے لیے تو غضبناک ہو سکتا ہے ورنہ سکون اور خاموشی ہی نظر آئے گی۔ اس کا بڑا سبب فانی کا بے نیازانہ طرزِ عمل تھا جس نے کبھی تمناؤں کو اجازت نہ دی کہ وہ خروش اور ہنگامہ پیدا کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ناقہم فانی کے کلام اور ان کی زندگی کے سکون اور تحمل کو، سکونِ مرگ، سے تعبیر کرنے لگتے ہیں۔

وہ قدرت کی طرف سے ایک حساس دل لے کر آئے تھے اور اسی حساس دل نے ان کو المیہ شاعر بنا دیا۔ کسی کا قول ہے "احساس رکھنے والوں کے لیے زندگی ایک المیہ ہے"۔ وہ اس المیہ زندگی کے اس قدر خوگر ہو گئے کہ حصولِ غم، ہی ان کے واسطے، حصولِ عشرت تھا، فانی نے کچھ عرصہ وکالت بھی کی، مگر جس دنیا میں جھوٹ اور ریاکاری کی گرم بازاری ہو جہاں انصاف کے نام پر انسانیت کا گلا کاٹا جاتا ہو۔ جہاں مزدور اور کسان اپنے خون پسینے کی کمائی سرمایہ داروں کے آستانوں پر لٹا دیتے ہوں۔ اس سے فانی کی غیور اور حساس طبیعت کیونکر میل کھا سکتی تھی۔ اس لیے وکالت

جز وعدۂ باطل نہیں بنیاد کچھ اس کی   دل کانپ اٹھا دیکھ کے ایوان تمنا

شوق سے ناکامی کی بدولت کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا
فصل گل آئی یا اجل آئی۔ کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آ پہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا
منزل عشق پہ تنہا پہونچے کوئی تمنا ساتھ نہ تھی
تھک تھک کر اس راہ میں آخر اک اک ساتھی چھوٹ گیا
فانی ہم تو جیتے جی وہ میت ہیں بے گور و کفن
غربت جس کو راس نہ آئی اور وطن بھی چھوٹ گیا

وائے نادانی یہ حسرت تھی کہ ہوتا در کھلا   ہم قفس راز اسیری کیا کہیں کیونکر کھلا
المنۃ للہ اک دعائے مرگ کے دو دو اثر   واں کھلا باب اجابت یاں قفس کا در کھلا
دیکھئے کیا گل کھلاتی ہے بہار اب کے برس   خواب میں فانی نے دیکھا ہے قفس کا در کھلا

حاصل علم بشر جہل کا عرفاں ہونا   عمر بھر عقل سے سیکھا کیے ناداں ہونا
دل بس اک لرزش پیہم ہے سراپا یعنی   تیرے آئینہ کو آتا نہیں حیراں ہونا
ہے ترا حسن تغافل جسے جو چاہے فریب   ورنہ تو اور جفاؤں پہ پشیماں ہونا
خاک فانی کی قسم ہے تجھے اے دشت جنوں   کس سے سیکھا ترے ذروں نے بیاباں ہونا

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گزر گیا   عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا

آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیرانِ زندگی یعنی جمالِ یار کا صدقہ اتر گیا

سایہ بھی جس پہ میرے نشیمن کا پڑ گیا کیوں آسماں وہ باغ ہی سارا اجڑ گیا
تو نے تو اپنے کام بگڑ کر بنا لیے میری نادانی وہ کام جو بن کر بگڑ گیا
صیاد یوں پروں میں گرہ باندھتے ہیں یہ بے دردِ بندِ بند کسی کا جکڑ گیا
بنتی نہیں ہے صبر کو رخصت کیے بغیر کام ان کی بے قرار نگاہوں سے پڑ گیا
وعدے کی رات گردشِ افلاک رک گئی جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا
بدلا ہوا ہے آج مرے آنسوؤں کا رنگ کیا دل کے زخم کا کوئی ٹانکا ادھڑ گیا
دل کی مفارقت کو کہاں تک نہ روئیے اللہ ایک عمر کا ساتھی بچھڑ گیا
اک حشر روز چاہیئے اس روسیاہ کو فانی زمین حشر میں غیرت سے گڑ گیا

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا اک جوش تھا کہ محوِ تماشائے جوش تھا
برپا تھا دل کی لاش پہ اک محشرِ سکوت تیرے شہیدِ ناز کا ماتم خموش تھا
امیدِ عفو ہے ترے انصاف سے مجھے شاہد ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا
ہر مژدہ نگاہ غلط جلوہ خود فریب عالم دلیلِ گمرہیٔ چشم و گوش تھا
وحشت بقیدِ چاکِ گریباں روا نہیں دیوانہ تھا جو معتقدِ اہلِ ہوش تھا

عشق کی دنیا زمیں سے آسماں تک شوق تھی تھا جو کچھ تیرے سوا آغوش ہی آغوش تھا
دل کی ہر کروٹ میں اک دنیا بنی اک مٹ گئی ہائے ان دو خون کی بوندوں میں کتنا جوش تھا

—

بوئے خزاں سے مست ہیں، یاد ہیں بہار کیا
ہم تو چمن پرست ہیں، پھول کہاں کے خار کیا

اپنے کمال شوق پر حشر کا دن ہے منحصر
وعدۂ دید چاہیئے زحمت انتظار کیا

خوشی سے رنج کا بدلا یہاں نہیں ملتا
وہ مل گئے تو مجھے آسماں نہیں ملتا

ہزار ڈھونڈھیئے اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے آستاں نہیں ملتا

بھڑک کے شعلۂ گل تو ہی اب لگا دے آگ
کہ بجلیوں کو مرا آشیاں نہیں ملتا

مجاز اور حقیقت کچھ اور ہے یعنی
تری نگاہ سے تیرا بیاں نہیں ملتا

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں
مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

تری تلاش کا انجام حاصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا، وہاں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ میہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

تجھے خبر ہے ترے تیر بے پناہ کی خیر
بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا

کسی نے تجھ کو نہ جانا مگر یہ کم جانا
یہ راز ہے کہ کوئی رازداں نہیں ملتا

مجھے عزیز سہی قدر دل تمہیں کیوں ہو
کمی تو دل کی نہیں دل کہاں نہیں ملتا

دیارِ عمر میں اب قحط مہر ہے فانی
کوئی اجل کے سوا مہرباں نہیں ملتا

بجلیاں ٹوٹ پڑیں جب وہ مقابل سے اٹھا
مل کے پلٹی تھیں نگاہیں کہ دھواں دل سے اٹھا

جلوہ محسوس سہی آنکھ کو آزاد تو کر
قید آداب تماشا بھی تو محفل سے اٹھا

خبر قافلۂ گم شدہ کس سے پوچھوں
اک بگولہ بھی نہ خاک رہ منزل سے اٹھا

موت ہستی پہ وہ تہمت تھی کہ آساں نہ تھی
زندگی مجھ پہ وہ الزام کہ مشکل سے اٹھا

کس کی کشتی تہ گرداب فنا جا پہونچی
شور لبیک جو فانی لب ساحل سے اٹھا

شبدے آنکھوں کے ہم نے ایسے کتنے دیکھے ہیں
آنکھ کھلی تو دنیا تھی بند ہوئی افسانہ تھا
عہد جوانی ختم ہوا اب مرتے ہیں نہ جیتے ہیں
ہم بھی جیتے تھے جب تک مرجانے کا زمانہ تھا

تعینات کے حد سے گذر رہی ہو نگاہ
بس اب خدا ہی خدا ہے نگاہ والوں کا

ذکر خورشید قیامت سن کے واعظ کیا کہوں
خیر اس نردامنی کی روز محشر دیکھنا

صبح تک فانی ہر آواز شکست دل کے ساتھ
کیا قیامت تھی وہ تیرا جانب در دیکھنا

ہمیں تیری محبت میں فقط دو کام آتے ہیں
جو لڑنے سے کبھی فرصت ہوئی خاموش ہو جانا

حجاب اگر من و تو کا نہ درمیاں ہوتا
پیام حسن محبت کی داستاں ہوتا

مراد جود ہے میری نگاہ خود نشاس
وہ راز ہوں کہ نہ ہوتا جو رازداں ہوتا

سکون خاطر بلبل ہے اضطراب بہار
نہ موج بوئے گل اٹھتی نہ آشیاں ہوتا

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز
کوئی تو اہل وفا کا مزاج داں ہوتا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

کہتے ہو کہ ہم وعدہ پرسش نہیں کرتے
یہ سن کے تو بیمار ہو ابھی نہیں جاتا

آتے ہیں عیادت کو تو کرتے ہیں نصیحت
احباب سے غم خوار ہو ابھی نہیں جاتا

خبر اپنی مغفرت کی تو نہیں یہ جانتا ہوں
مری توبہ چاہتی ہے دیر توبہ باز ہوتا
مرے شوق نے سکھایا اسے شیوۂ تغافل
نہ مجھے نیاز ہوتا نہ وہ بے نیاز ہوتا

نگاہِ شوق میرا مدعا تو انکو سمجھا دے
مرے منہ سے تو حرفِ آرزو مشکل سے نکلے گا

تیرا نگاہ شوق کوئی رازداں نہ تھا
آنکھوں کو در نہ جلوہ جاناں کہاں نہ تھا
عالم جز اعتبار نہاں و عیاں نہ تھا
یعنی کہ تو عیاں نہ ہوا اور نہاں نہ تھا
مفہوم کائنات تمہارے سوا نہیں
تم چھپ گئے نظر سے تو سارا جہاں نہ تھا
ہر شاخ، ہر شجر سے تھی بجلیوں کو لاگ
ہر شاخ، ہر شجر پہ مرا آشیاں نہ تھا
اللہ رے بے نیازیٔ آدابِ التفات
دیکھا مجھے تو پائے نظر درمیاں نہ تھا
میرے دلِ شعور کا حسن طلب تو دیکھ
گویا زباں پہ حرفِ تمنا گراں نہ تھا
تو نے کرم کیا تو بعنوانِ رنج زیست
غم بھی مجھے دیا تو غمِ جاوداں نہ تھا
فانی سکونِ موت کی تاثیر دیکھنا
ٹھہرا وہ دل کہ جس پہ سکوں کا گماں نہ تھا

ٹوٹا طلسمِ ہستیٔ فانی کے راز کا
احسان مند ہوں الم جاں گداز کا
تمہید صد ہزار قیامت ہے ہر نفس
عنوان شوق ہوں گلہ ہائے دراز کا
اٹھتی نہیں ہے تہمتِ نظارہ جمال
منہ دیکھتا ہوں جلوۂ حسرت نواز کا
فانی دوائے درد جگر زہر تو نہیں
کیوں ہاتھ کانپتا ہے مرے چارہ ساز کا

اور تسلی سے سوا ہو گیا
درد جگر یہ تجھے کیا ہو گیا

موت کی نیند آ گئی بیمار کو
غیب سے سامان شفا ہو گیا

اور ہی بل ہے تری زلفوں میں آج
کون گرفتار بلا ہو گیا

چارہ تپ ہجر کا اب کیا کروں
زہر بھی کم بخت دوا ہو گیا

اب بھی ترا وعدہ وفا ہو نہ ہو
موت کا وعدہ تو وفا ہو گیا

مفت دو عالم ہے وہ تیر نگاہ
جو مری شامت سے خطا ہو گیا

رگ رگ کو درد دل نے رگ جاں بنا دیا
اس کفر ما سوا کو بھی ایماں بنا دیا

میری نگاہ مغفرت عجز خاک تھی
تیری نظر نے خاک کو انساں بنا دیا

غم کو بنا کے محرم اسرار کائنات
ہر نقش غم کو پیکر انساں بنا دیا

خود برق ہو اور طور تجلا سے گذر جا
خود شعلہ بن اور وادئ سینا سے گذر جا

بے واسطہ خود نگہی اپنی طرف دیکھ
آئینہ اٹھا حسن خود آرا سے گذر جا

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک
اس مرحلۂ سعئ تماشا سے گذر جا

ذرے میں ہے گم وسعت صد عالم صحرا
ذرے کو سمجھ وسعت صحرا سے گذر جا

کعبہ ہو کہ ہو دیر یہ دنیا ہو کہ عقبیٰ
ہر منزل و ہر جادہ و ہر جا سے گذر جا

اے عزم خبر ہوش کے پردوں کو الٹ دے
اے ذوق نظر محمل لیلا سے گذر جا

یوں سب کو بھلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے
دنیا ہی میں رہنا ہے تو دنیا سے گذر جا

اٹھ بزم تحیر سے وہ کہتے ہیں ادھر آ
جا اور حد امکان تمنا سے گذر جا

کشتی کا سہارا ہی تو گرداب ہے فانی
دریا ہی میں تو ڈوب کے دریا سے گذر جا

راز دل سے نہیں واقف دل ناداں میرا ترے عرفاں سے کبھی دشوار ہے عرفاں میرا

کیوں جنوں پھر نہ بیاباں میں بہار آئی ہو بڑھ چلا ہے مرے دامن سے گریباں میرا

فطرت عشق کی آزاد اداؤں کو تو دیکھ وسعت عالم تخئیل ہے زنداں میرا

بھول جانے کے سوا اب مجھے کچھ یاد نہیں کل کی ہے بات کہ تو عہد فراموش نہ تھا

تجھ میں اور تیرے تصور میں جدائی تھی محال درمیاں کوئی حجاب غم آغوش نہ تھا

اسیر بند دل ہو کر غم دنیا سے فارغ ہوں مری آزادیوں کا راز ہے مجبور ہو جانا

بے اعتبار وعدۂ فردا نہیں رہا اب یہ بھی زندگی کا سہارا نہیں رہا

کیا کیا گلے نہ تھے کہ ادھر دیکھتے نہیں دیکھا تو کوئی دیکھنے والا نہیں رہا

تم مجھ سے کیا پھرے کہ قیامت سی آگئی یہ کیا ہوا کہ کوئی کسی کا نہیں رہا

اللہ رے چشم ہوش کی کثرت پرستیاں ذرے ہی رہ گئے کوئی صحرا نہیں رہا

دے ان پہ جان جن کو غرض ہو کے دل کے بعد ان کی نگاہ کا وہ تقاضا نہیں رہا

واہمہ کی یہ مشق پیہم کیا یاس و امید شادی و غم کیا

تم کو اس راز ماسوا کی قسم تم پہ چھایا ہوا ہے عالم کیا

ان کے آگے غم اک فسانہ ہے ان سے کہیے فسانہ غم کیا

عیش رفتہ کی یاد سے حاصل قصۂ خلد و ذکر آدم کیا

اذن ہنگامہ نگاہ نہ دے کیا ہماری بساط اور ہم کیا

مٹ گیا نام عاشقی اب اور چاہتا ہے وہ حسن برہم کیا

میری فطرت نے ہے گوش بر آواز | سن رہا ہوں نوائے محرم کیا
غم تو واعظ غم بہشت بھی ہے | امتیاز غم جہنم کیا
تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا | ہم تمھارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا
پھر ملی غیب سے نوید نشاط | غم کے ساماں ہوئے فراہم کیا

آئینہ و دل دونوں کہنے ہی کی باتیں تھیں
تیری ہی تجلی تھی اور تو ہی مقابل تھا
ہر باطل و ہر نا حق اک راز حقیقت ہے
جس شکل میں حق آیا وابستہ باطل تھا

وہ کہتے ہیں کہ ہے ٹوٹے ہوئے دل پر کرم میرا
مگر منجملۂ آداب غم خواری ہے غم میرا
وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا
بقا کہتے جس کو وہ مرا احسان ہے فانی
وہ حادثہ ہوں کہ دنیائے قدم بھرتی ہے دم میرا

حال پر میرے فرش کے ذرے عرش کے تارے روتے ہیں
آپ کی آنکھیں تر کیا ہوتیں کوئی پلک نمناک ہوا
میر سوا تھے اور جو پڑے سارے کے سارے چاک ہوئے
یہ بھی اگر اللہ نے چاہا کوئی دم میں چاک ہوا

یہی نہ ایک حقیقت کہ بے نیاز ہے تو
دل غیور کو اتنی سی بات نے مارا

کیا ہوئیں داورِ محشر وہ خطائیں میری
کچھ نہیں فردِ عمل میں تری رحمت کے سوا

اس بحرِ بے کراں میں، ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کر جا

دنیائے رنج و راحت، کچھ ہوں تری بلا سے
دنیا کی ہر ادا سے منہ پھیر کر گزر جا

یہ دعویٰ خبر ہے عصیاں بھی ہے سزا بھی
بے ہوش بے خبر رہ بے خوف بے خطر جا

گھبرا گیا خرد کی تاریکیوں سے فانی
اے نورِ عشق دل کی گہرائیوں میں بھر جا

جھک گیا تیرے آستاں پہ جو سر
پھر کسی آستاں پہ خم نہ ہوا

اس کو میرا نصیب کہتے ہیں
جو تری زلف خم بہ خم نہ ہوا

رہ گئی حسرتِ دعا باقی
دل کو اندازۂ ستم نہ ہوا

بت نے ہر رنگ میں خدائی کی
دل مگر دیر سے حرم نہ ہوا

دم بھی فانی کسی کے غم تک ہے
دم نہ ہوگا اگر یہ غم نہ ہوا

ماسوا کی راہ سے جانا پڑا ہے کوئے دوست
کفر بھی دیکھی بدولت جزوِ ایماں ہو گیا

اسکے دامن سے الجھتا ہے ادب اے دستِ شوق
یہ بھی دیوانے کوئی میرا گریباں ہو گیا

ادعائے ضبطِ غم بالکل بجا یکسر درست
اور جو دل کا حال چہرے سے نمایاں ہو گیا

ہر ذرہ جلوہ گاہ ہے ہر دل ہے چشمِ شوق
اللہ رے اہتمام تماشائے یار کا

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

میں نزع میں ہوں عہدِ وفا کا محل نہیں
وعدہ نہ کر کہ وقت نہیں اعتبار کا

فانی یقین وعدۂ فردا کو کیا کہوں / اب زندگی ہے نام فقط انتظار کا

بالیں پہ جب تم آئے تو آئی وہ موت بھی / جس موت کے لیے مجھے جینا ضرور تھا
تھی ان کے روبرو بھی وہی شان اضطراب / دل کو بھی اپنی وضع پہ کتنا غرور تھا

یوں منتظم جہاں درہم و برہم نہ ہوا تھا / ایسا کبھی ترے حسن کا عالم نہ ہوا تھا
پھر چھیڑ دیا وسعت محشر کی فضا نے / سودا ترے وحشی کا ابھی کم نہ ہوا تھا
یا عشرت نو روزہ تھا یا حسرت دیروز / وہ لمحۂ ہستی جو ابھی غم نہ ہوا تھا
قاتل ہی مرا کیوں اسے کہتا ہے زمانہ / مانا وہ شریک صف ماتم نہ ہوا تھا
پاتے ہی خجل رحم کا دریا امنڈ آیا / پردہ مری آنکھوں کا ابھی نم نہ ہوا تھا
اک کفر سراپا نے کیا حشر کا قائل / میں معتقد حشر مجسم نہ ہوا تھا
گھر جبر سے تقدیر نے ویرانہ بنایا / سامانِ جنوں مجھ سے فراہم نہ ہوا تھا

عشق کا ایک تصور اور سہی / موت کے سر سے تو الزام اٹھا
ہل گئی پھر مرے دل کی دنیا / درد پھر لے کے ترا نام اٹھا
ابر اٹھا سمت حرم سے زاہد / تو بھی سجادہ الٹ جام اٹھا

سنگ در دیکھ کے، سر یاد آیا / کوئی دیوانہ، مگر یاد آیا
آئینہ اب نہیں دیکھا جاتا / میں بہ عنوان دگر یاد آیا
درد کو پھر ہے مرے دل کی تلاش / خانہ برباد کو گھر یاد آیا

اور فانی دو متضاد لفظ بن کر رہ گئے۔

فانی کی زندگی کو جن لوگوں نے قریب سے دیکھا ہے وہ ان کی زندگی کا اہم جزو ان کی تواضع اور انکسار کو بتاتے ہیں۔ ان کے مزاج میں خاموشی کے ساتھ ایک خاص قسم کی سنجیدگی تھی جس سے ناواقف مرعوب ہو جاتا اور جس کو اجنبی تمکنت و غرور پر محمول کرتا۔ اسی کے ساتھ جب وہ مخصوص احباب سے ملتے تو یہ نہ پتہ چلتا کہ اس ہنسنے والے شخص کی زندگی کی داستان کتنی المناک ہے۔ انھوں نے اپنی حالت کا ذکر کبھی احباب کے سامنے نہیں کیا اس سے ان کے ضبط اور اعلیٰ کردار کا پتہ چلتا ہے۔ قاضی عبدالغفار کلیات فانی کے دیباچہ میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"ان کے آنے سے پہلے میں ان کا کلام سنا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ شاعر اچھا ہے معلوم نہیں کہ آدمی کیسا ہے ــــ؟ جب ان کو دیکھا تو معلوم ہوا جتنا کہ وہ شاعر ہے اس سے زیادہ انسان ہے"[1]

آگے بڑھ کر لکھتے ہیں:۔

"میں کسی دوسرے شاعر کو نہیں جانتا جس نے اپنی شاعری کو اپنی زندگی کے تاثرات۔ اپنی حقیقی واردات قلب اور اپنے تمام تر انسانی احساسات کا اس قدر صحیح آئینہ دار بنایا ہو۔ فانی کی شاعری یکسر خود فانی ہی کی مہجور روح ہے۔ اس شاعری کو فانی کی روح سے الگ کر لیجئے یا فانی کی روح کو اس شاعری سے خارج کر دیجئے (گو یہ دونوں باتیں ممکن نہیں) تو کیا رہ جاتا ہے ان اوراق میں سوائے ایک وحشت زدہ اور ویران خلا کے۔"[2]

---

[1] [2] مقدمہ کلیات فانی۔ قاضی عبدالغفار

اس کو بھولے تو ہوئے ہو فانیؔ — کیا کروگے وہ اگر یاد آیا

تونے رکھ لی گناہ گار کی شرم — کام آیا نہ انفعال اپنا
دیکھ دل کی زمیں لرزتی ہے — یادِ جاناں قدم سنبھال اپنا
باخبر ہیں وہ سب کی حالت سے — لاؤ ہم پوچھ لیں نہ حال اپنا
موت بھی تو نہ مل سکی فانیؔ — کس سے پورا ہوا سوال اپنا

ہستی و فنا راحت و ایذا سے گزر جا — جب سرحدِ دل سامنے آجائے ٹھہر جا
سرکارِ محبت میں خبر بے ادبی ہے — اے تشنۂ دیوانگیٔ ہوش اتر جا
اک عمر پرستارِ شبِ ہجر رہا تھا — اے زلفِ سیہ ماتمِ فانیؔ میں بکھر جا

نقد و بینش لائے تھے ہم جلوۂ جاناں کو دل — وہ بھی حسرت کشِ کشمکش ہائے تماشا ہو گیا
نذرِ دردِ دل، غمِ دنیا کیا — اک مٹایا داغ اک پیدا کیا

زندگی کا کوئی پہلو بھی نہ تھا جو غم نہ تھا — ہوش کا سودا، جنونِ عاشقی سے کم نہ تھا
مجھ سے ہر جلوے نے سیکھا، امتیازِ قلب و سنگ — ورنہ حسنِ دوست کا، آگے تو یہ عالم نہ تھا
رسمِ خودداری سے گو واقف نہ تھی دنیائے عشق — پھر بھی اپنا زخمِ دل، شرمندۂ مرہم نہ تھا

دوسرا نام ہے شبِ فرقت — میری تقدیر کی سیاہی کا
بخش دے جبرِ کل کے صدقے میں — ہر گنہ، میری بے گناہی کا
آپ کا نام لینے والوں کو — فقر کا ہوش ہے نہ شاہی کا

—

ردیف "ب"

عشق ہے پرتو حسن محبوب — آپ ہی اپنی تمنا کیا خوب
طلب محض ہے سارا عالم — کوئی طالب ہے نہ کوئی مطلوب
قلب، ادراک، دماغ اور حواس — مجھ سے منسوب ہیں تجھ سے مغلوب

ردیف "ت"

اب مجھی کو طول شام ہجر کا شکوہ بھی ہے — خود ہی چھیڑی تھی حدیث طرۂ گیسوئے دوست
آسماں کا شکر واجب ہے گلہ جائز نہیں — آسماں سے ملتی جلتی ہے جہاں تک خوئے دوست

ردیف "د"

ترا اشارہ ترا ساز برق سے نہ سہی — تجھے خبر ہے کہ جلتا ہے آشیاں صیاد
نہ آ قریب کہ پروردۂ فنا ہوں میں — بنا ہے برق کے تنکوں سے آشیاں صیاد
بس ایک آہ جہاں سوز کے اثر تک ہیں — یہ خار۔ برق قفس۔ دام، آسماں صیاد
چمن میں دل ہے تو میری نگاہ میں ہے چمن — چمن سے تر مجھے لے جائے گا کہاں صیاد
یہ جذب شوق اسیری ہے ورنہ اے فانی — کہاں میں سوختہ دل منت پرکہاں صیاد

دل محشر بے خودی ہے اللہ اللہ — یاد اور کسی بھول جانے والے کی یاد
پابندئ رسم برطرف کیوں اے موت — ان کے بھی کیے ہیں تو نے قیدی آزاد

ردیف "ر"

وہ خواب فریبِ جمال ہے جو نظر تھی جلوۂ یار پر
مجھے اب بہار سے کیا غرض کہ مری خزاں ہے بہار پر

قسمت کے حرف سجدۂ در سے مٹا تو دوں   دل کانپتا ہے شوخیٔ تدبیر دیکھ کر

نامراد ہنے تک نامراد جیتے رہیں   سانس بن گیا اک اک نالہ نارسا ہو کر
بڑھتا ہے نہ گھٹتا ہے مرتے ہیں نہ جیتے ہیں   درد پر خدا کی ناز دل میں رہ گیا ہو کر
زندگی سے ہو بیزار فانی اس سے کیا حاصل   موت کو منا لو گے جان سے خفا ہو کر

جتنے غم چاہے دیے جا مجھے یارب لیکن   ہر نئے غم کے لیے تازہ جگر پیدا کر
یا اسے کر کسی بجلی کے حوالے یارب   یا مرے نخلِ تمنا میں ثمر پیدا کر

اے تقاضائے خرد مجھ پہ یہ بیداد نہ کر   میں ہوں دیوانۂ محبت مجھے برباد نہ کر

روح اربابِ محبت کی لرز جاتی ہے   تو پشیمان نہ ہو اپنی جفا یاد نہ کر
صبر شایانِ محبت تو نہیں ہے لیکن   شکر اگر بن نہ پڑے شکوۂ بیداد نہ کر

یہ محشر ہے یہاں جو چاک ہے رحمت بداماں ہے
وہ دنیا تھی جو ہنستی ہی رہی ہر چاک داماں پر

اللہ رے اعتماد محبت کہ آج تک
وہ جان ہی نہیں جو نہ ہو جائے نذر دوست

ہر درد کی دوا ہیں وہ اچھا کیے بغیر
دل ہی نہیں ہے اس کی تمنا کیے بغیر

ہر تبسم کو چمن میں گریہ ساماں دیکھ کر
جی لرز جاتا ہے ان غنچوں کو خنداں دیکھ کر

خیمہ اپنا غم پرستی تبلہ اپنا خاک دل
روح غم کو پیکر خاکی میں انساں دیکھ کر

اس کو انعام خودی اور اس پہ لطف بیخودی
وہ کرم کرتے ہیں ظرف اہل عرفاں دیکھ کر

جی ڈھونڈتا ہے گھر کوئی دونوں جہاں سے دور
اس آپکی زمیں سے الگ آسماں سے دور

شاید میں در خور نگہ گرم بھی نہیں
بجلی تڑپ رہی ہے مرے آشیاں سے دور

وہ پوچھتے ہیں اور کوئی دیتا نہیں جواب
کس کی دعا ہے دسترس امتحاں سے دور

آنکھیں چرا کے آپ نے انسا نہ کر دیا
جو حال تھا زباں سے قریب اور بیاں سے دور

ہے منع راہ عشق میں دیر و حرم کا ہوش
یعنی کہاں سے پاس ہے منزل کہاں سے دور

تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھلا کہ ہم
ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

بنایا تھا نشیمن شاخ گل پر کس گھڑی یارب
بجھی جاتی ہے ہر برق بلا شاخ نشیمن پر

ہنسی آتی ہے تیری سادگی شوق پر فانی
وہ میت ہی پہ کب آئے جواب آئیں گے مدفن پر

ردیف "ز"

کون اٹھائے مری وفا کے ناز
دل ستم دوست و مہ رقیب نواز

اب نئے سر سے چھیڑ پردۂ ساز — میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز
کھل گیا میری زندگی کا راز — اے شبِ ہجر تیری عمر دراز
صور و منصور و طور ارے توبہ — ایک ہے تیری بات کا انداز
دیکھئے کیا ہو عشق کا انجام — دل کی ہستی ہے موت کا آغاز
رہ گئی تھی جو بازوؤں میں سکت — ہو گئی صرفِ ہمتِ پرواز
آج روزِ وصالِ فانی ہے — موت سے ہو رہے ہیں راز و نیاز

دو دے جا ہٹا کے سرحدِ ناز — دل ہے آوارۂ حدودِ نیاز
ہوں مگر کیا یہ کچھ نہیں معلوم — میری ہستی ہے غیب کی آواز
ہوں اسیرِ فریبِ آزادی — پر ہیں اور شوقِ حیلۂ پرواز
آج اچھے نہیں الٰہی خیر — درد کے تیور، آہ کے انداز
ہاں یہاں کوئی شے نہیں باطل — عشق ہے رازِ عقل پردۂ راز

اللہ اللہ یہ شانِ کشتۂ ناز — ہے مری خاک سجدہ گاہِ نماز
ہاں شبِ ہجر آج صبح نہ ہو — ہاں چلی جائے یادِ زلفِ دراز
آج پہلو میں کیوں ہے سناٹا — کیا ہوئی آہ آہ کی آواز

ردیف "ش"

کچھ نہ وحدت ہو نہ کثرت، نہ حقیقت نہ مجاز — یہ ترا عالمِ مستی وہ ترا عالمِ ہوش

ردیف "غ"

دل کچھ نہ تھا تمھاری نظر نے بنا دیا — دنیائے درد۔ عالم حسرت، جہانِ داغ
وہ تیری بزم تھی نہ ملی جس میں چپ کی داد — یہ حشر ہے یہاں تو کھلے گی زبانِ داغ

ردیف "ک"

موت ہے ایک وقفۂ موہوم — زندگانی سے زندگانی تک
مہربانی کی آس رہنے دے — کون جیتا ہے مہربانی تک
ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا — بات پہونچی تری جوانی تک
نیند تھی چشمِ نازنیں فانی — ایک بے خواب کی کہانی تک

ردیف "ل"

اک حق کے سوا کوئی ہستی ہی نہ تھی یارب — یوں لا مرے سر آنکھوں پہ تمیزِ حق و باطل
ہر دل میں ترا جلوہ، ہر لب پہ ترا چرچا — غم زینتِ صد خلوت غم رونقِ صد محفل

ردیف "م"

تجھ پہ رکھتے ہیں حشر میں الزام — آ نہ جائے زباں پہ تیرا نام
ضبط کی کوششیں بھی جاری ہیں — درد بھی کر رہا ہے اپنا کام
کس سے اب درد کی دوا چاہوں — درد اٹھتا ہے لے کے تیرا نام

میں نے گویا صلۂ مہر و وفا پایا
کاش اتنا ہی وہ کہدیں کہ خطا کار ہیں ہم
وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی
دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

دوست تسلی دینے آئے لے کے دوائیں چارہ گر آیا
لیجئے آئی زخم جگر پر اور اک تازہ آفت مرہم
ڈوب ہی جا اے کشتی ہستی کچھ تو ہو آخر ورنہ کہاں تک
بحر تلاطم خیز جہاں میں یوں ہی رہیں گے زیر و زبر ہم

نہ ابتدا کی خبر ہے نہ انتہا معلوم
رہا یہ وہم کہ ہم ہیں سو وہ بھی کیا معلوم
دعا تو خیر دعا سے امید خیر بھی ہے
یہ مدعا ہے تو انجام مدعا معلوم
یہ زندگی کی ہے روداد مختصر فانی
وجود درد مسلّم علاج نا معلوم

نور و ظلمت جدا نہیں ہوتے
آپ کی چشم سرمہ سا کی قسم
میں ہوں فانی صحیفۂ باقی
حرف بے معنیٔ فنا کی قسم

ردیف "ن"

وہ بے خبر شوق ہیں کچھ ان سے نہ کہنا
وہ درد محبت ترے ہم راز نہیں ہیں

ایک وہی مختار ہیں ہم تو کہنے کو مجبور نہیں
ان کی رضا کے بندوں میں آزادی کا دستور نہیں

کس نے سنایا حال ہمارا آج جو یہ ارشاد ہوا
درد محبت والوں کو سنتے ہیں شفا منظور نہیں

غم کو ثبات بھی آخر کب تک اور یہ حیات بھی آخر کب تک
ہم بھی نہ ہوں گے۔ غم بھی نہ ہوگا وہ دن بھی کچھ دور نہیں

جن میں تمہارا نور رہا تھا ان میں اندھیرا رہتا ہے
جب سے گئے، ہو آنکھوں میں آنسو تو بہت ہیں نور نہیں

یہ تو برے آثار ہیں فانی۔ غم ہو، خوشی ہو، کچھ تو ہو
دل کا یہ کیا حال ہوا معلوم نہیں مسرور نہیں

زخم نصیب تھا جگر، زخم جگر سے کیا کہیں
ان کی نظر نے کیا کیا ان کی نظر سے کیا کہیں

رسم وفا سے بے خبر ہم بھی نہیں مگر حضور
بس بھی تو آنسوؤں پہ ہو دیدۂ تر سے کیا کہیں

آہ انھیں کی ہے عطا خیرہ بے اثر سہی
دیں گے اثر بھی اب یہی باب اثر سے کیا کہیں

راز و نیاز ہے کہیں منہ سے نکالنے کی بات
سجدۂ دل کی واردات سجدۂ سر سے کیا کہیں

شکوۂ غم سے فائدہ۔ شکر ستم بھی کیا ضرور
حسن کے شعبدوں کا حال شعبدہ گر سے کیا کہیں

دل کے سوا یہاں کوئی محرم درد دل نہیں
بے خبروں سے کیوں کہیں، اہل خبر سے کیا کہیں

حسن جفا پسند سے، حسرت عرض شوق کیا
تشنہ لبی کا ماجرا، آب گہر سے کیا کہیں

دل کے چمن کی ہر کلی دیر ہوئی کہ جل گئی
باد سحر کو کیا خبر، باد سحر سے کیا کہیں

فانی اب ان سے عرض حال کیجئے بار بار کیا
دشمنے سر سے کیا سنیں، ہم نے سر سے کیا کہیں

کشتیٔ اعتبار توڑ کے دیکھ
کہ خدا بھی ہے ناخدا ہی نہیں

میری ہستی گواہ ہے کہ مجھے　　تو کسی وقت بھولتا ہی نہیں

ناخوشگوار ہے جو محبت کا تذکرہ　　اچھا تو لاؤ اور کوئی گفتگو کریں
فرقت میں موت مانگنے والوں کا کیا قصور　　آخر یہ نامراد کوئی آرزو کریں
مطلب یہ ہے کہ آج ہوئی نذر دل قبول　　ارشاد ہے کہ آئینہ ہم رو برو کریں

کیے جائیں گے دل کے خاتمے پر شکر کے سجدے
وفاؤں نے کیا ہے خون حسرت سے وضو برسوں
جیے جانے کی ہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی
ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں
مری اک عمر فانی نزع کے عالم میں گزری ہے
محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں

آدرنہ جانتا ہوں فریب نظر کو میں　　دیکھوں الٹ کے پردۂ داغ جگر کو میں
ہر نقش پا کو دیکھ کے دھتا ہوں سر کو میں　　پہچانتا نہیں ہوں تری رہ گزر کو میں
گم کردہ راہ ہوں قدم اولیں کے بعد　　پھر راہبر مجھے نہ ملا راہبر کو میں
وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو　　پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں
پہلا نہ دل، نہ تیر کی شام غم گئی　　یہ جانتا تو آگ لگاتا نہ گھر کو میں
دو تین ہچکیوں میں دم نزع کہہ گیا　　شرح دراز زندگی مختصر کو میں
فانی دعائے مرگ کی فرصت نہیں مجھے　　یعنی ابھی تو ڈھونڈھ رہا ہوں اثر کو میں

دل رہے آلودۂ دامن اور ہم دیکھا کریں
آج اے اشکِ ندامت آب تجھے دریا کریں
جسمِ آزادی میں پھونکی تو نے مجبوری کی روح
خیر جو چاہا کیا اب یہ بتا ہم کیا کریں
خون کے چھینٹوں سے کچھ پھولوں کے خاکے ہی سہی
موسمِ گل آگیا، زنداں میں بیٹھے کیا کریں
جا بجا تغیرِ حال دل کے چرچے ہیں تو ہوں
ہم ہوئے رسوا مگر اب ہم کسے رسوا کریں
مرگ بے ہنگام فانی سوجہ تسکیں ہو چکی
زندگی سے آپ گھبراتے ہیں گھبرایا کریں

فصلِ خبر بڑھا گئی عمر کے باب راز میں
یادِ وصال مختصر میں کے شب دراز میں
ہم نہ ازل سے آج تک سجدے سے سر اٹھا سکے
چھپ رہے جلوہ ہائے دوست کعبہ کے حریمِ ناز میں
حشر میں حشر چاہیئے۔ حشر پہ حشر چاہیے
دفن ہیں سجدہ ہائے شوق ناصیہ نیاز میں
زہر ہے یا دوائے دل وہ ہیں کہ موت ہے قریب
رعشہ مری نظر میں ہے یا کفِ چارہ ساز میں

فانی کی زندگی کے دو پہلو ہمیشہ نمایاں رہے ہیں میری مراد ان کے غم دوراں اور غم جاناں سے ہے۔ غم جاناں کے تصدق میں زمانے کا غم فراموش تو نہ کرسکے مگر ان کی بدولت ان کا ذہنی بوجھ ہلکا ہوگیا۔ فانی کو زندگی میں عشوہ و ناز و ادا سے بھی واسطہ پڑا۔ خوبان روزگار کے ستم بھی برداشت کیے مگر انھوں نے اپنی محبت کا کبھی سودا نہیں کیا۔ کسی سے اس کا نظریہ محبت دریافت کیا گیا تو اس نے کہا کہ "محبت صرف محبت کے لیے کرنا چاہیئے"۔

تا عرض شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ
اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

فانی کی محبت بے لوث اور بوالہوسی سے پاک تھی تعجب یہ ہے کہ جس کوچہ میں جرأت و مومن اور داغ بدنام ہوگئے۔ وہاں سے فانی اپنا دامن بچا کر لے آئے، مجازی عشق کے باوجود انھوں نے مجاز کی آلودگیوں سے دامن کو ملوث نہ ہونے دیا۔ مولوی وحید احمد اپنے مضمون میں لکھتے ہیں :۔

"راوی معتبر یہ کہتا ہے کہ پاک محبت تھی اور مجھے اس میں ذرا بھی تامل نہیں۔ اگر پاک محبت نہ ہوتی تو یہ سوز و درد نہ ہوتا غم عشق اور غم روزگار دونوں کو فانی نے گوارا کیا"[1]۔

عشق خواہ مجاز کے رنگ میں ہو یا حقیقت کے۔ ان کی شاعری کا سب سے بڑا محرک تھا۔ اس عشق نے ان کی شخصیت کی تکمیل کی اور اسی کے ذریعہ ان میں وہ احساس پیدا ہوا جس کو جمالیاتی حسن سے تعبیر کیا جاتا ہے عشق کی بدولت ان میں وہ پاکیزگی اور لطافت پیدا ہوئی جو اس کے بغیر ممکن نہ تھی۔ وہ غم کے بوجھ کو برداشت نہ کرسکتے تھے۔ اگر محبت کا جذبہ لطیف اس کو ہلکا نہ کر دیتا۔ جب

---

[1] یاد ایام عشرت فانی۔ وحید احمد علی گڈھ میگزین فانی نمبر

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں
ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں
آسماں بھی ترے کوچے کی زمیں ہے لیکن
وہ زمیں جس پہ ترا سایہ دیوار نہیں

ہے عکس روئے دوست پر اک پرتو مجاز
میری نظر بھی کھنچ گئی تصویر یار میں
دعویٰ یہ ہے کہ دوری معشوق ہے کمال
مطلب یہ ہے کہ قرب نہیں اختیار میں
قربان اک ادائے تغافل پہ لاکھ بار
وہ زندگی جو صرف ہوئی انتظار میں

جتنے منہ ہیں اتنی باتیں دل کا پتہ کیا خاک چلے
جس نے دل کی چوری کی ہے ایک اسی کا نام نہیں
رک رک کے جو سانسیں آئیں گئیں مانا کہ وہ آہیں تھیں لیکن
آپ نے تیور کیوں بدلے آہوں میں کسی کا نام نہیں
جلوہ و دل میں فرق نہیں، جلوے ہی کو اب دل کہتے ہیں
یعنی عشق کی ہستی کا آغاز تو ہے انجام نہیں
کب سے پڑی ہیں دل میں تیرے ذکر کی ساری راہیں بند
برسیں گذریں اس بستی میں رسم سلام و پیام نہیں
دل سے کسی کی آنکھوں تک کچھ راز کی باتیں پہنچی ہیں
آنکھ سے دل تک آیا ہو ایسا تو کوئی پیغام نہیں
نزع میں فانی تو نے یہ کس کا چپکے چپکے نام لیا
کیوں او کافر تیری زباں پر اب بھی خدا کا نام نہیں

دل وقف تپش ہے ہائے مگر وجہ تپشِ دل کوئی نہیں
بسمل ہوں مگر کیوں بسمل ہوں فریاد کہ قاتل کوئی نہیں

کس زعم میں ہے اے رہرو غم دھوکے میں نہ آنا منزل کے
یہ راہ بہت کچھ جھانی ہے اس راہ میں منزل کوئی نہیں

یہ واہمہ تھا یا مشکل تھی کیوں میں نے کہا کیا نادم ہوں
وہ پوچھتے ہیں کیا مشکل ہے کیا کہیئے کہ مشکل کوئی نہیں

دریائے محبت بے ساحل اور ساحل بے دریا بھی ہے
جو موج ڈبو دے ساحل ہے یوں نام کو ساحل کوئی نہیں

گو جلوۂ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں
تا حدِ نظر میں شامل ہے نظارہ میں شامل کوئی نہیں

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرق مجاز و حقیقت کیا
یہ عرض حقیقت ہے وہ حقیقت ہستیٔ باطل کوئی نہیں

فانی ہی وہ اک دیوانہ تھا جو موت سے پہلے مر جائے
کیا ہوش کی کافر دنیا میں اس موت کے قابل کوئی نہیں

رہ جائے کیوں فنا کا ہنگامہ نامکمل — کچھ میری زندگی سے لے لیجئے بلائیں
ہاں اے یقین وعدہ داں تیرا نہ چھوٹے — یہ آسرا نہ ٹوٹے وہ آئیں یا نہ آئیں

جس طرف دیکھ لیا پھونک دیا طور مجاز — یہ ترے دیکھنے والے وہ نظر رکھتے ہیں
خود تغافل نے دیا مژدۂ بے دادِ مجھے — اللہ اللہ مرے نالے بھی اثر رکھتے ہیں
بے بسی دیکھ یہ سو بار کیا عہد کہ اب — تجھ سے امید نہ رکھیں گے مگر رکھتے ہیں

میری نظروں میں تو بے واسطۂ دید ہے تو
میں بہ عنوان تجلی بھی تجھے یاد نہیں

آشیاں پر گرم برق کی باری آئی
مژدہ اے ذوقِ بلا باغ میں صیاد نہیں

جور کو جور بھی اب کیا کہئے
خود وہ تڑپا کے تڑپ جاتے ہیں

دل سے فانی یہ الجھ پڑنا کیسا
آپ دیوانے کے منہ آتے ہیں

سمجھو تو غنیمت ہے مرا گریۂ خونیں
یہ رنگ ہے پھولوں میں نہ یہ بات حنا میں

جھک جاتے ہیں سجدے میں سر اور پھر نہیں اٹھتے
کیا سحر ہے کافر ترے نقشِ کفِ پا میں

سنتے تھے محبت آساں ہے واللہ بہت آساں ہے مگر
اس سہل میں جو دشواری ہے وہ مشکل سی مشکل میں نہیں

جب ڈوبنے والے ڈوب چکے اور ساحل و دریا ایک ہوئے
پھر لطف امید و بیم کہاں دریا میں نہیں ساحل میں نہیں

ان کے آگے جب یہ آنکھیں ڈبڈبا کر رہ گئیں
وہ حیا پرور نگاہیں مسکرا کر رہ گئیں

گھر جلاتے تو ہو مگر کس کا
دل ہے بندہ نواز طور نہیں

تم پہ مرنا حسیں نہیں آتا
زندگی کا انہیں شعور نہیں

ہم بھی اپنی وفا پہ ہیں مغرور
بات کی بات ہے غرور نہیں

ہم نہ تھے کل کی بات ہے فانی
ہم نہ ہوں گے وہ دن بھی دور نہیں

ماورائے حد ہر منزل ہے شاید کوئے دوست
ہم نے جو چھانی نہ ہو ایسی کوئی منزل نہیں

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جئے جانے سے کچھ حاصل نہیں

نا مہربانیوں کا گلہ تم سے کیا کریں
ہم بھی کچھ اپنے حال پہ اب مہرباں نہیں

ساری ہے درد دل مری رگ رگ میں چارہ ساز
کیا پوچھتا ہے درد کہاں ہے کہاں نہیں

تیرا کرم کہ تو نے وہ دل کو عطا کیا
جو غم بقدر حوصلہ آسماں نہیں

بجلی کہیں گری ہو مگر ہم تفس مجھے
ڈر ہے کہ اب کسی نے کہا آشیاں نہیں

گردش میں تھا وہ ایک ہی جلوہ کہاں کہاں
تھی فرش راہ چشم تماشا کہاں کہاں

بزم الست، دار فنا۔ جلوہ گاہ حشر
پہونچی ہے لے کے ان کی تمنا کہاں کہاں

ذرے میں دشت، قطرے میں طوفاں چھپے ہے
ڈالا مری نگاہ نے پردہ کہاں کہاں

قلب و جگر کے درد کا پھر کس کو ہوش تھا
جب اس نے مسکرا کے یہ پوچھا کہاں کہاں

آخر نگاہ دوست میں فانی نے پا لیا
یوں مرگ ناگہاں تجھے ڈھونڈا کہاں کہاں

جب کی ہے فکر تجزیۂ ہر مثال میں
گم ہو گئی ہے ان کی تجلی جمال میں

امکان معرفت کو سمو کر محال میں
وہ دل ہیں یوں ہے کہ نہ آئے خیال میں

ملتی نہیں قصور ہستی سے اب نجات
گھر سا گیا ہوں حلقۂ دام خیال میں

آخر زمانہ آئینہ دکھلا کے رہ گیا
لانا پڑا تمھیں کو تمھاری مثال میں

اہل دنیا مجھے سمجھ لیں گے
دل کسی دن ذرا لہو تو کریں

قسمت ہوئی تھیں روز ازل جتنی شوخیاں
سب جمع ہو گئیں نگہ شرمسار میں

ساز ہستی کو بھی اب غم کے اشارے سے نہ چھیڑ
اس میں ٹوٹے ہوئے دل کی نہ ہو آواز کہیں

مر کر ترے خیال کو ٹالے ہوئے تو ہیں
ہم جان دے کے دل کو سنبھالے ہوئے تو ہیں

ہاں درد عشق ان پہ کرم کی نظر رہے
صبر و قرار تیرے حوالے ہوئے تو ہیں

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی
سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

اپنی تو ساری عمر ہی فانی گذار دی
اک مرگ ناگہاں کے غم انتظار میں

ردیف "و"

مآل سوز غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ
بھڑک اٹھی ہے شمع زندگانی دیکھتے جاؤ

غرور حسن کا صدقہ کوئی جاتا ہے دنیا سے
کسی کی خاک میں ملتی جوانی دیکھتے جاؤ

بہار زندگی کا لطف دیکھا اور دیکھو گے — کسی کا عیش مرگ ناگہانی دیکھتے جاؤ
سنے جاتے نہ تھے تم سے مرے دن رات کے شکوے — کفن سرکاؤ میری بے زبانی دیکھتے جاؤ
وہ اٹھا شور ماتم آخری دیدار میت پر — اب اٹھا چاہتی ہے نعش فانی دیکھتے جاؤ

بہار آئی کہ یارب عید آئی اہل زنداں کو
گریباں نے گلے لپٹا لیا ہے. بڑھ کے داماں کو
مرے تلووں سے کانٹوں پر نئی گلکاریاں ہوں گی
مری وحشت مبارک ہو جنون عیش ساماں کو

بیاباں کو یہاں لے آئے تھے کچھ خاک کے ذرّے
یہی ذرے اڑا لے جائیں گے اک دن بیاباں کو
نہ آیا موسم گل جب دل دیوانہ جیتا تھا
جو اب آئے تو یارب آگ لگ جائے گلستاں کو
چھٹے جب قید ہستی سے تو آئے کنج ہستی میں
رہا ہوتے ہیں یعنی ہم بدل دیتے ہیں زنداں کو
خدا رکھے محبت کو نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں
اجل کہتے ہیں جس کو وہ ہماری زندگی کیوں ہو

بہار لائی ہے پیغام انقلاب بہار — سمجھ رہا ہوں میں کلیوں کے مسکرانے کو
نہ پوچھیے کہ محبت میں مجھ پہ کیا گذری — نہ چھیڑیے مرے بھولے ہوئے فسانے کو
یہ شعبدے، یہ کرشمے کسے میسّر تھے — تری نگاہ نے سکھلا دیے زمانے کو

چمن میں برق نے جھانکا کہ ہم لرز اٹھے
اب اس سے آگ ہی لگ جائے آشیانے کو

خیال یار بھی کھویا ہوا سا رہتا ہے
اب ان کی یاد بھی آتی ہے بھول جانے کو

زمانہ برسر آزار تھا مگر فانی
تڑپ کے ہم نے بھی تڑپا دیا زمانے کو

گویا نہیں تغافل و تمکین میں کوئی فرق
اتنی بھی آدمی کو امید کرم نہ ہو

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی
کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

منظور ہر نوشتۂ تقدیر ہے مجھے
لیکن وہ جس میں حرف تمنا رقم نہ ہو

اے بے خودی ٹھہر کہ بہت دن گذر گئے
مجھ کو خیال یار کہیں ڈھونڈھتا نہ ہو

اچھا حجاب ہے کہ جب آتے ہیں خواب میں
پھر پھر کے دیکھتے ہیں کوئی دیکھتا نہ ہو

ردیف "ہ"

غربت میں سنگ راہ کچھ آسانیاں بھی تھیں
کھاتی ہیں ٹھوکریں مری مشکل جگہ جگہ

ہر کلمۂ الحق میں اک کیف انا بھر دوں
توبہ سے جو ٹکرا دوں الٹا ہوا پیمانہ

کچھ تذکرہ جنت، کچھ تذکرہ کوثر
کیا یوں بھی نہیں جائز ذکر مے و میخانہ

حیرت نے مجھے تیرا آئینہ بنایا ہے
اب تو مجھے دیکھا کر اے جلوہ جانانہ

حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے
راز تقدیر الٰہی کو نہ پوچھ

زندگی جادۂ بے منزل ہے
مسلک رہبر و راہی کو نہ پوچھ

غلط انداز نگاہوں کو سنبھال میری گستاخ نگاہی کو نہ پوچھ

دل کی طرف حجاب تکلف اٹھا کے دیکھ آئینہ دیکھ اور ذرا مسکرا کے دیکھ
ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی ایمان زندگی پہ نہ لا آزما کے دیکھ
تیری تجلیوں سے کسی طرح کم نہیں دل کی تجلیوں کو کبھی دل میں لا کے دیکھ
اب کی ادائے خاص سے کر امتحان دل جو برق طور پر نہ گری ہو گرا کے دیکھ
فانی سفینہ اب بھی نہ ڈوبے تو کیا کرے طوفان کو نہ دیکھ۔ ستم ناخدا کے دیکھ

ردیف "ی"

کہتے ہیں ذرا پھر سے افسانہ غم کہیئے اس حسن تجاہل کو کس طرح کرم کہیئے
تھوڑی کبھی بہت ہوگی فرصت ہی میں سن لینا یہ دل کی کہانی ہے کیا کیجیے جو کم کہیئے

دیکھا نہ اہل دل نے کسی دن اٹھا کے آنکھ دنیا گذر گئی غم دنیا لیے ہوئے
اٹھنا وہ تیرے در سے کسی نامراد کا اک آہ زیر لب کا سہارا لیے ہوئے

ہم موت بھی آئے تو مسرور نہیں ہوتے مجبور غم اتنے بھی مجبور نہیں ہوتے
ارباب محبت پہ تم ظلم کے بانی ہو یہ دور نہ محبت کے دستور نہیں ہوتے
کونین پہ بھاری ہے اللہ رے غرور ان کا اتنے بھی ادا والے مغرور نہیں ہوتے

تم کیا جانو کیا شے ہے طوفان سرشک خونیں کا
تم نے چھلکتے ہی نہیں دیکھی دل کی گلابی کیا کہیئے

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر انھیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرزِ تبسم - یہ شادابی کیا کہیے
کتنے فتنے جمع کیے ہیں ان کی ایک جوانی نے
چال قیامت، کافر نظریں۔ آنکھ شرابی کیا کہیے

قصۂ زیست مختصر کرتے کچھ تو اپنی سی چارہ گر کرتے
موت کی نیند سو گئے بیمار روز کس شام کی سحر کرتے
سچ ہے ہر نالہ کیوں رسا ہوتا میرے نالے تجھے کیوں اثر کرتے
کرلیا تیرے نام پر سجدہ اب کہاں قصدِ سنگِ در کرتے
کاش آئینہ ہاتھ سے رکھ کر تم مرے حال پر نظر کرتے

دل کی جو حقیقت ہے کیا کہیے حسن بھی دل ہے عشق بھی دل
ہر شمع جلائی جاتی ہے پردے میں کسی پروانے کے

عہد جوانی اور پھر دل میں ان کی محبت کیا کہیے
دیوانے کا خواب اور وہ بھی خواب قیامت کیا کہیے

کچھ بس ہی نہ تھا ورنہ یہ الزام نہ لیتے ہم تجھ سے چھپا کر بھی ترا نام نہ لیتے
کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

اللہ رے سکون قلب اس کا دل جس نے لاکھوں توڑ دیے

جس زلف نے دنیا برہم کی وہ آپ کبھی برہم نہ ہوئی

دل کی یہ ویرانی ہی عجب ہے وہ بھی آخر کیا کرتے
جب دل میں ان کے رہتے بستے یہ ویرانی کم نہ ہوئی

احباب سے کیا کہیئے اتنا نہ ہوا فانی
جب ذکر مرا آتا مرنے کی دعا کرتے

جب پرسش حال وہ فرماتے ہیں جانئے کیا ہو جاتا ہے
کچھ یوں بھی زباں نہیں کھلتی کچھ درد سوا ہو جاتا ہے

اب خیر سے ان کی بزم کا اتنا رنگ تو بدلا میرے بعد
جب نام مرا آجاتا ہے کچھ ذکر وفا ہو جاتا ہے

یکتائے زمانہ ہونے پر صاحب یہ غرور خدائی کا
سب کچھ ہو مگر خاکم بدہن کیا کوئی خدا ہو جاتا ہے

قطرہ قطرہ رہتا ہے دریا سے جدا رہ سکنے تک
جو تاب جدائی لا نہ سکے وہ قطرہ فنا ہو جاتا ہے

پھر دل سے فانی سارے کے سارے نقش جفا مٹ جاتے ہیں
جس وقت وہ ظالم سامنے آکر جان حیا ہو جاتا ہے

تم سے بھی ہو آگاہ پھر اپنی بھی خبر ہو — دیوانہ تمہارا کوئی دیوانہ نہیں ہے
جل جانے کے انداز کوئی شمع سے سیکھے — پروانہ ہے اور کہنے کو پروانہ نہیں ہے

مجازی عشق کی قوت کا یہ حال ہے تو عشق حقیقی کی گیرائی اور گہرائی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے اس میں بھی فانی کی انفرادیت ہر ہر قدم پر دامن دل کھینچتی ہے ملاحظہ ہو :۔

اور ہی بل ہے تری زلفوں میں آج
کون گرفتار بلا ہو گیا

سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی
آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

تم سے نسبت ہے اعتبار اپنا
ہم تمہارے ہیں ورنہ پھر ہم کیا

چن لیا تیری محبت نے مجھے
اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے
پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا

زندگی کے اس پیچ وخم سے گذرتے ہوئے فانی کی المیہ زندگی آگے بڑھتی ہے۔ مگر ہر قدم ایک نئے طوفان کا پیش خیمہ اور ہر ارادہ ایک ٹوٹنے والی امید کی تمہید ہوتا۔ زمانے کی کج ادائیاں۔ محبت کی ناکامیاں۔ عزیزوں کی بے وفائیاں اور راہنمائے دہر کی ناقدر شناسیاں، ان کی زندگی کا عبرتناک مرقع تھیں۔ دوستوں کے طریق کار کی کتنی صحیح ترجمانی انھوں نے کی ہے۔

آرام کے ساتھی ہیں فراغت کے شریک
البتہ نہیں گردش قسمت کے شریک

غم خوار خدا نخواستہ کیوں ہوتے
احباب کا مفہوم ہے راحت کے شریک

وطن والوں کی بے رخی اور تلاش معاش کی سرگردانی نے ان کو در در کی خاک چھنوائی مگر وطن سے جس قسمت کو لے کر چلے تھے غربت میں بھی وہی ساتھ رہی آرام نہ وطن میں میسّر ہوا اور نہ فراغت کی زندگی غربت میں پا سکے۔

گردش وہی یہاں بھی سپہر کہن میں تھی
غربت میں ساتھ بھی وہی جو قسمت وطن میں تھی

ان کی آواز آرہی تھی دل کے پاس
روز بڑھتی ہی رہی اک آرزو

دیر تک کچھ گفتگو کرتے رہے
روز ترک آرزو کرتے رہے

دل کو نہ کیوں کہوں جو ازل سے خراب ہے
جب تو یہ تھا کہ ہے وہ تجلی حجاب میں

یہ کیوں کہوں کہ ان کی تمنا عذاب ہے
اب کچھ نہیں تو ان کی تجلی حجاب ہے

خلشیں تھیں ہمارے دم کے ساتھ
پھول کو پھول جاننے والے
تیز تر جادۂ فنا سے گزر
ان کی نظریں ہی کچھ کہیں تو کہیں
مرگِ فانی میں اب تو دیر نہ کر

آج کانٹے نکل گئے دل کے
کل یہ چھینٹے تھے خون بسمل کے
مٹ رہے ہیں نشان منزل کے
ان کی نظروں نے کیا کیا مل کے
سہل فرمانے والے مشکل کے

تمہارا در تو در ہاں بنا لیا ہم نے
پلٹ پلٹ کے قفس ہی کی سمت جاتا ہوں

اب اور سوچیے تدبیر دل دکھانے کی
کسی نے راہ بتائی نہ آشیانے کی

مشتاق خبردار ہیں دل سے، جگر سے
دل جن سے ملے اب وہ نگاہیں نہیں ملتیں
پیکاں کے بھی ٹکڑے ہیں رفو کے بھی ہیں ٹانکے
کیا پھر ترے ناوک نے کیا عزم نوازش
کس بیکس کے مشتاق کا ماتم ہے کہ فانی

ملتی ہے زمانے کی نظر ان کی نظر سے
ملنے کو تو ملتی ہے نظر ان کی نظر سے
سینہ میں ہوا الخیر ہے اٹھتا ہے کدھر سے
لبیک کی آتی ہے صدا چاک جگر سے
روتی ہے گلے مل کے سحر شمع سحر سے

چمکا دیا ہے رنگ چمن لالہ زار نے
شاید خزاں کو آگ لگا دی بہار نے

تربت کے پھول شام سے مرجھا کے رہ گئے
رو رو کی صبح کی مری شمع مزار نے

ہاں ہم نہ تھے فریب تمنا سے بے خبر
کیا کہیئے کیا کیا دل امیدوار نے

آزردہ کیوں ہوئے مری آشفتگی سے تم
آخر یہی تو زلف شکن در شکن میں تھی

اس کے سوا نہیں خبر آشیاں مجھے
میں تھا اسیر دام تو بجلی چمن میں تھی

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

بدلا ہوا تھا رنگ گلوں کا ترے بغیر
کچھ خاک سی اڑی ہوئی سارے چمن میں تھی

لو آج مرگ فانی بے کس سے مٹ گئی
وہ اک خلش جو خاطر اہل وطن میں تھی

ہم اپنے جی سے گذرے یوں سحر کی
شب غم بڑھ چلی تھی مختصر کی

تمہیں کس دل سے اپنی جان کہیئے
وفا اس نے تو کی اور عمر بھر کی

مرا قتل ان کے ہاتھوں یہ تو باتیں
کچھ ان کے منہ کی ہیں کچھ نامہ بر کی

اٹھا ہاتھ اے تصور فاتحہ کو
یہ دل کی ہے وہ تربت ہے جگر کی

کم ہے یا بڑھ گئی وحشت ترے دیوانوں کی
دامنوں کی ہے خراب نہ گریبانوں کی

فصل گل خیر تو ہے دشت میں دیوانوں کی
دامنوں کی خبر آئی نہ گریبانوں کی

طوق منت کے بڑھا۔ ہو گئی منت پوری
بیڑیاں موت نے کاٹیں ترے دیوانوں کی

دل کے تیور تو بجھے یاس کے چھینٹوں سے مگر
نہ بجھی آگ لگائی ہوئی ارمانوں کی

چشم ساقی کی وہ مخمور نگاہی توبہ
آنکھ پڑتی ہے چھلکتے ہوئے پیمانوں کی

اب جفا ہے نہ وفا یاد وفا باقی ہے
تھی جہاں شمع وہاں خاک ہے پروانے کی

آتی رہے گی خیر اب اس زندگی کو موت
یہ تو ہوا کہ موت مری زندگی ہوئی

میں منزل فنا کا نشان شکستہ ہوں
تصویر گرد باد وفا ہوں مٹی ہوئی

مرحوم کس ادا کے تماشائیوں میں تھا
پھرتی ہے دل کی لاش تماشا بنی ہوئی

کیجئے دعا کہ رات تو کرے دردمند عشق
اول تو دل کی چوٹ پھر اتنی دکھی ہوئی

یارب نوائے دل سے تو کان آشنا سے ہیں
آواز آرہی ہے یہ کب کی سنی ہوئی

متاع جلوہ تحیر ہے۔ مجھ کو سکتا ہے
دل آئینہ ہے کہ منہ آئینہ کا تکتا ہے

خفا نہ ہو تو یہ پوچھوں کہ تیری جان سے دور
جو تیرے ہجر میں جیتا ہے مر بھی سکتا ہے

بشر میں عکس موجودات عالم ہم نے دیکھا ہے
وہ قطرہ ہے یہ قطرہ لیکن اس قطرہ میں دریا ہے

مری آنکھوں میں آنسو تجھ سے ہمدم کیا کہوں کیا ہے
ٹھہر جائے تو انگارہ ہے بہہ جائے تو دریا ہے

تمہارے ظلم، طعنے غیر کے، لوگوں کے آوازے
محبت میں دل مجبور کو سب کچھ گوارا ہے

محبت ہی نہیں تو پاس آداب محبت کیا
وفا کی یا جفا کی جانے دو یہ ذکر ہی کیا ہے

یہ کیا کہتے ہو فانی سے کہ تیری موت آئی ہے
تم اس ناکام کے دل سے تو پوچھو زندگی کیا ہے

یاس کے آتے ہی ارمان دل سے یہ کہہ کر چلے
ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے

دیکھئے کیا ہو وہ اور آزردگی بے سبب
ہم خطا ناکردہ خو گر عذر بے تقصیر کے

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو
اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

تاکید ہے کہ دیدۂ دل وا کرے کوئی
مطلب یہ ہے کہ دور سے دیکھا کرے کوئی

آتے ہی تیرے وعدۂ فردا کا اعتبار
گھبرا کے مر نہ جائے تو پھر کیا کرے کوئی

کہتے ہیں حسن کی ہی امانت ہے درد عشق
اب کیا کسی کے عشق کا دعوا کرے کوئی

وہ جلوہ بے حجاب سہی ضد کا کیا علاج
جب دل میں رہ کے آنکھ سے پردا کرے کوئی

خالی ہے بزم ذوق طلب اہل ہوش سے
اتنا نہیں کہ تیری تمنا کرے کوئی

وہ درد دے کہ موت بھی جس کی دوا نہ ہو
اس دل کو موت دے جسے اچھا کرے کوئی

فانی دعائے مرگ کی تکرار کیا ضرور
غافل نہیں کہ ان سے تقاضا کرے کوئی

کیوں کر میں کہوں تم نے آئینہ نہیں دیکھا
بے وجہ نہیں ہرگز آئینہ کو حیرانی

ہاں میرے قدم سے ہے ویرانے کی آبادی
واں گھر میں خدا رکھے آباد ہے ویرانی

فانی وہ بلا کش ہوں غم بھی مجھے راحت ہے
میں نے غم راحت کی صورت بھی نہ پہچانی

یوں مٹ گئی وفا کہ زمانے کا ذکر کیا
اب دوست سے بھی کوئی شکایت نہیں رہی

اب لب پہ وہ ہنگامۂ فریاد نہیں ہے
اللہ رے تری یاد کہ کچھ یاد نہیں ہے

آتی ہے صبا سوئے لحد ان کی گلی سے
شاید مری مٹی ابھی برباد نہیں ہے

اللہ بچائے اثر ضبط سے ان کو
بے داد تو ہے شکوۂ بیداد نہیں ہے

آمادۂ فریاد رسی ہے وہ ستم گر
فریاد کہ اب طاقت فریاد نہیں ہے

دنیا میں دیار دل فانی کے سوا ہائے
کوئی بھی وہ بستی ہے جو آباد نہیں ہے

صد تما تریں گے اسیرانِ قفس چھوٹے ہیں — بجلیاں لے کے نشیمن پہ گھٹا بھی آئی

ہاں نہ تھا بابِ اثر بند مگر کیا کہیے — آہ پہنچی تھی کہ دشمن کی دعا بھی آئی

لو مسیحا نے بھی اللہ نے بھی یاد کیا — آج بیمار کو ہچکی بھی قضا بھی آئی

افشائے رازِ اہلِ جنوں مصلحت نہیں — پھرتا ہوں جیبوں کو گریباں کیے ہوئے

کیوں اہلِ حشر ہے کوئی نقادِ سوزِ دل — لایا ہوں دل کے داغ نمایاں کیے ہوئے

دنیا مری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے
موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہے

آبادی بھی دیکھی ہے ویرانے بھی دیکھے ہیں
جو اجڑے اور پھر نہ بسے دل وہ نرالی بستی ہے

خود جو نہ ہونے کا ہو عدم کیا اسے ہونا کہتے ہیں
نیست نہ ہو تو ہست نہیں یہ ہستی کیا ہستی ہے

عجزِ گناہ کے دم تک ہیں عصمتِ کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے رازِ بلندی پستی ہے

جان سی شے بک جاتی ہے ایک نظر کے بدلے میں
آگے مرضی گاہک کی ان داموں تو سستی ہے

وحشتِ دل سے پھرنا ہے اپنے خدا سے پھر جانا
دیوانے یہ ہوش نہیں یہ تو ہوش پرستی ہے

جگ سونا ہے تیرے بغیر آنکھوں کا کیا حال ہوا
جب بھی دنیا بستی تھی اب بھی دنیا بستی ہے

آنسو تھے سو خشک ہوئے بھی ہے کہ امڈ آتا ہے
دل پہ گھٹا سی چھائی ہے کھلتی ہے نہ برستی ہے

دل کا اجڑنا سہل سہی سننا سہل نہیں ظالم
بستی بسنا کھیل نہیں بستے بستے بستی ہے

فانی جس میں آنسو کیا دل کے لہو کا کال نہ تھا
ہائے وہ آنکھ اب پانی کی دو بوندوں کو ترستی ہے

محشر میں عذر قتل بھی ہے خوں بہا بھی ہے
وہ اک نگاہ جس میں گلہ بھی حیا بھی ہے

اس درد کا علاج اجل کے سوا بھی ہے
کیوں چارہ ساز تجھ کو امید شفا بھی ہے

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے

ہاں دل میں درد بھی ہے زباں بھی نہیں ہے ہنوز
کس سے کہیں کوئی دل درد آشنا بھی ہے

سامان صد نگاہ ہے ہر ذرہ خاک کا
لیکن یہ دیکھنا ہے کوئی دیکھتا بھی ہے

فانی کف قاتل میں شمشیر نظر آئی
بے خواب محبت کی تعبیر نظر آئی

ہر عیش کی محفل میں پروانہ کا ماتم تھا
جو شمع نظر آئی دل گیر نظر آئی

کعبہ میں کلیسا میں ہم نے تو جہاں دیکھا
اے قصر و فا تیری تعمیر نظر آئی

دنیا کی بلاؤں کو جب جمع کیا میں نے
دھندلی سی مجھے دل کی تصویر نظر آئی

دل ان کے نہ آنے تک سرمایۂ شکایت تھا
وہ آئے تو اپنی ہی تقصیر نظر آئی

فانی غم ہستی نے زندہ ہی مجھے سمجھا
جب تک مرے مرنے میں تاخیر نظر آئی

کی وفا یار سے ایک ایک جفا کے بدلے
ہم نے گن گن کے لیے خون وفا کے بدلے
کی سپرد تربت خانہ اجل نے مری خاک
کس کو سونپا مجھے ظالم نے خدا کے بدلے
کفن اے گور لحد دیکھ نہ میلا ہو جائے
آج ہی ہم نے یہ کپڑے ہیں نہا کے بدلے
عشق اللہ بچائے وہ مرض ہے فانی
زہر بیمار کو دیتے ہیں دوا کے بدلے

ترک غم ساحل کا حاصل نظر آتا ہے
لے ڈوبنے والے وہ ساحل نظر آتا ہے
دل کھوئے ہوئے برسوں گذرے ہیں مگر اب بھی
آنسو نکل آتے ہیں جب دل نظر آتا ہے
آغاز محبت میں جینے ہی کے لالے تھے
اب خیر سے مرنا بھی مشکل نظر آتا ہے
تو مست خود آرائی ہم حسن کے متوالے
جو ہے تری محفل میں غافل نظر آتا ہے
موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی
گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

اب بھی میں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دولھن بن کے شباب آتا ہے
ہجر میں بھی مجھے امداد اجل تھی درکار
میری تربت پہ نہ آ تجھ سے حجاب آتا ہے
دید آخر ہے الٹ دیجئے چہرے سے نقاب
آج مشتاق کے چہرے پہ نقاب آتا ہے
کس طرف جوش کرم تیری نگاہیں اٹھیں
کون محشر میں سر دار عتاب آتا ہے
موت کی نیند بھی اب چین سے سونا معلوم
کیا جنازہ پہ وہ غارت گر خواب آتا ہے
دل کو اس طرح ٹھہر جانے کی عادت تو نہ تھی
کیوں اجل کیا ترے نامے کا جواب آتا ہے

جس قدر چاہے وہ جلوؤں کو فزانی دے
ہاں نظر دے تو مجھے فرصت حیرانی دے

وحشت تازہ کو نوروز مبارک لے عشق
پھر بہار آئی مجھے خلعت عریانی دے

اپنے دیوانے پہ اتمام کرم کر یا رب
در و دیوار دیے اب انھیں ویرانی دے

ابھری ہوئی ہے چوٹ دل دردمند کی
رکھنا قدم تصور جاناں سنبھال کے

کہتے ہیں جن کو عرف محبت میں داغ دل
وہ نقش تو نہ ہوں ترے پائے خیال کے

سمائیں آنکھ میں کیا شعبدے قیامت کے
مری نظر میں ہیں جلوے کسی کی قامت کے

یہاں بلائے شب غم، وہاں بہار شباب
کسی کی رات کسی کے ہیں دن قیامت کے

ستارے ہوں تو ستارے نہ ہوں تو برق بلا
چراغ ہیں تو یہ ہیں بیکسوں کی تربت کے

مانا کہ بات وعدۂ فردا پہ ٹل گئی
اور بے وفا جو کل بھی نہ آج کل گئی

تم کیوں گئے تھے آئینہ خانہ میں بے حجاب
اچھا ہوا کہ شرم و شرارت میں چل گئی

اس خانہ خراب کی بربادیاں نہ پوچھ
یاد شبخیر آہ بھی دل سے نکل گئی

کچھ کہہ کے چارہ ساز نے تسکین دی تو ہے
سنتا تو ہوں کہ اب مری حالت سنبھل گئی

تعمیر آشیاں کی ہوس کا ہے نام برق
جب ہم نے کوئی شاخ چنی شاخ جل گئی

فانی کے دل سے آیہ لاتقنطو کے بعد
زاہد وہ دل فریبیٔ حسن عمل گئی

قطرہ دریائے آشنائی ہے
کیا تری شان کبریائی ہے

تیری مرضی جو دیکھ پائی ہے
خلش درد بن کے آئی ہے

وہم کو بھی ترا نشاں نہ ملا
نارسائی سی نارسائی ہے

جلوہ یار کا بھکاری ہوں
شش جہت کاسہ گدائی ہے

بچھ گئے راہ یار میں کانٹے
کس کو عذر برہنہ پائی ہے

مژدۂ جنت وصال ہے موت
زندگی محشر جدائی ہے

امید التفات کو رسوا نہ کیجئے
لازم نہیں کہ خون تمنا نہ کیجئے

سرکار پاس وضع جفا چاہتا ہو تمیں
یہ بھی اگر وفا ہے تو اچھا نہ کیجئے

کیا فرض تھی نگاہ مکرر ازل کے بعد
یہ جان ہے، یہ دل ہے تقاضا نہ کیجئے

شرمندہ وہم رشک سے اتنا نہ کیجئے
آئینہ دیکھ کر مجھے دیکھا نہ کیجئے

لبریز تموج تھا اک اک خط پیمانہ
محفل سے جو وہ اٹھ لیتے ہوئے انگڑائی

پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا
جب ذکر بہار آیا سمجھے کہ بہار آئی

ادا سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے
مری قضا کو وہ لائے دلہن بنائے ہوئے

تمھیں کہو تمھیں اپنا سمجھ کے کیا پایا
مگر یہی کہ جو اپنے تھے سب پرائے ہوئے

سحر ہوئی کہ وہ یاد شب بخیر آتا ہے
چراغ ہیں مری تربت کے جھلملائے ہوئے

کارواں گذرا کیا ہم رہ گزر دیکھا کیے
ہر قدم پر نقش پائے راہبر دیکھا کیے

یاس جب چھائی امیدیں ہاتھ مل کر رہ گئیں
دل کی محفل چھٹ گئیں اور چارہ گر دیکھا کیے

رخ مری جانب نگاہ لطف دشمن کی طرف
یوں ادھر دیکھا کیے گویا ادھر دیکھا کیے

تو کہاں تھی اے اجل اے نامرادوں کی مراد
مرنے والے راہ تیری عمر بھر دیکھا کیے

مجھے قسم ہے ترے صبر آزمانے کی
کہ دل کو اب نہیں برداشت غم اٹھانے کی

ترا اسیر ہوں چاہے تو ذبح کر کھیاد
نہ توڑ دل یہ امانت ہے آشیانے کی

خیال یار ہے اک حسن و عشق کی دنیا
مری نگاہ میں ہیں گردشیں زمانے کی

گلہ ضرور نہیں، حال بے خودی معلوم
تمھاری یاد کو عادت ہے بھول جانے کی

زبان حال تھمے، داستان عشق نہ چھیڑ
کہ خواب مرگ ہے تاثیر اس فسانے کی

نہ دل کے ظرف کو دیکھو، نہ ظرف کو دیکھو
بلا کی بھن ہے تمھیں بجلیاں گرانے کی

نہ سانس کا ہے بھروسہ نہ آہ میں تاثیر
وہ کیا پھرے کہ ہوا پھر گئی زمانے کی

نہ بن پڑا کوئی عذر جفا کسی سے تو ہائے
ادا وہ یاد ہے گھبرا کے روٹھ جانے کی

جبین درد ہے بے تاب سجدہ اے فانی
کہ ٹھہرے خاک ترے دل کے آستانے کی

گناہ گار کی حالت ہے رحم کے قابل
غریب کش مکش جبر و اختیار میں ہے

چمن سے رخصت فانی قریب ہے شاید
کچھ اب کے بار کفن دامن بہار میں ہے

یا میرے بے شمار گناہوں سے درگذر
یا میرے عذر سن کرم بے حساب سے

دشمن جاں تھے تو جان دعا کیوں ہو گئے
تم کسی کی زندگی کا آسرا کیوں ہو گئے

کچھ نہ کہنا وہ کسی مجبور خاموشی کا ہائے
وہ جنازے پر ترا کہنا خفا کیوں ہو گئے

کیا تھیں اندازۂ ضبط محبت ہو گیا
چشم بد دور اب ستم حد سے سوا کیوں ہو گئے

فانی دکن میں آکے یہ عقدہ کھُلا کہ ہم ہندوستاں میں رہتے ہیں ہندوستاں سے دور

فانی کے تخلص کو صرف شاعرانہ اعتبار سے ہی اہمیت حاصل نہیں ہے بلکہ اسں تخلص کی روشنی میں ان کی زندگی کی بڑی گہری نفسیاتی حقیقت پوشیدہ ہے کہ انھوں نے عیش و عشرت کو کبھی باقی نہ جانا۔ اپنے دل کی آرزوؤں کا مدفن بنا دیا جہاں امید نے کبھی بسیرا نہیں لیا۔ فانی کے مذاقِ زندگی کا یہی رجحان تھا جس نے شوکت سے فانی کی طرف مراجعت کی۔ فانی کی ذات اپنے دور ہی کی نہیں بلکہ تاریخِ ادب اردو کے ان چند نفوس میں سے تھی۔ جن کے یہاں زندگی اور شعر میں کامل آہنگی پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری کے موضوعات کا مطالعہ کر جائیے۔ اس میں صرف وہی عنوانات ملیں گے جن کو فانی نے قریب سے دیکھا ہے اور پرکھا ہے۔ اس نقطۂ نظر سے نظری اختلاف تو ممکن ہے مگر فانی کی چشمِ حقیقت نگر، سے دیکھئے تو اس کی صداقت کا پتہ چلے گا۔ ان کی شاعری کے موضوعات غم۔ عشق۔ جبر۔ ہمہ اوست۔ ناپائداری دنیا۔ بے ثباتی کائنات کسی بھی عنوان کو لے لیجئے اور فانی کی زندگی سے ان کا رشتہ ملائیے ان میں وہی صداقت ملے گی جو ایک سچے انسان اور سچے فن کار کے یہاں ضروری ہے۔ فانی کی سیرت اور کردار کے بارے میں ان کے ہم عصروں کی ایک ہی رائے ہے کہ وہ خوددار بے باک اور مذہبی اقدار کا احترام کرنے والے تھے۔ ان میں چند کی رائیں یہاں بیان کرنا شاید بے محل نہ ہوگا۔

جگر مراد آبادی: —— وہ ایک یار بے تکلف تھے۔ سراپا خلوص اور مجسم شرافت۔ ان کے خلاف اکثر سازشیں ہوتی رہیں۔ لیکن ہمیشہ بے نیازانہ دامن بچاتے رہے۔ ان کے نام نہاد احباب نے بارہا ان کو دھوکے دیئے لیکن وہ ہمیشہ دھوکے کھاتے رہے۔ یہ نہیں کہ فانی ایک سادہ لوح انسان تھے۔

نہیں ضرور کہ مر جائیں جاں نثار ترے — یہی ہے موت کہ جینا حرام ہو جائے
تری خدائی میں ہوتی ہے ہر سحر کی شام — الٰہی اپنی سحر کی بھی شام ہو جائے

وہ مری شکایت پر چپ کھڑے ہیں عذر یہ — بت انھیں بنا پایا اب خدا خدا کر کے
لذت فنا ہر گز گفتنی نہیں یعنی — دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے

اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے وہم — بلبلا ہے عین دریا پھر بھی دامن چیدہ ہے

دیکھ فانی وہ کوئی حشر اٹھاتا آیا — چونک اب خواب لحد سے کہ سحر ہوتی ہے

اللہ اللہ سرخیٔ رنگ شفق کیوں اے جنوں — آسماں کیا کوچۂ قاتل کی زمیں ہونے کو ہے

اے داغ دل اے کھوئے ہوئے دل کی نشانی — آ فانیٔ بے دل تجھے سینے سے لگا لے

گو ہستی تھی خواب پریشاں نیند کچھ ایسی گہری تھی — چونک اٹھے تھے ہم گھبرا کے پھر بھی آنکھ نہ کھلتی تھی

روداد مرگ و زیست یہ ہے قصہ مختصر — مجبور زندگی کو بھی جینا محال ہے

اے تری شان کہ بت خانہ سے کعبہ بن جائے — دل کہ مسکن ہے ترا کعبہ سے بت خانہ بنے
لب تک آجائے غم ہجر تو شکوہ ہو جائے — آپ سن لیں تو عجب کیا ہو کہ افسانہ بنے

یا کہتے تھے کچھ کہتے جب اس نے کہا کہیے — تو چپ ہیں کہ کیا کہیے کھلتی ہے زباں کوئی

اک فسانہ سن گئے اک کہہ گئے — میں جو رویا مسکرا کر رہ گئے
یا ترے محتاج ہیں اے خونِ دل — یا انھیں آنکھوں سے دریا بہہ گئے
موت ان کا منہ ہی تکتی رہ گئی — جو تری فرقت کے صدمے سہہ گئے
پھر کسی کی یاد نے تڑپا دیا — پھر کلیجہ تھام کر ہم رہ گئے
اٹھ گئے دنیا سے فانی اہلِ ذوق — ایک ہم مرنے کو زندہ رہ گئے

ہر دل ہے تیرے غم کی امانت لیے ہوئے — ذرے ہیں اک جہانِ حقیقت لیے ہوئے
دے اذنِ عامِ عشق کو تاراجِ ہوش کا — بیٹھا ہوں دل میں صبر کی دولت لیے ہوئے
محشر میں جبرِ دوست سے طالب ہوں داد کا — آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

کل تک یہی گلشن تھا صیاد بھی بجلی بھی — دنیا ہی بدل دی ہے تعمیرِ نشیمن نے

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

جب قفس میں موسمِ گل کا تصور بندھ گیا — ہر طرف اجڑا ہوا اک آشیاں دیکھا کیے

جلوہ ترا طلسمِ حجاباتِ نور ہے — جو جس قدر قریب ہے اتنا ہی دور ہے

تسلیم ہیں مجھے بھی تری بے نیازیاں
یہ کیا کہوں کہ میری تمنا غیور ہے

وہ دیکھ سامنے ہیں نشیب و فراز شوق
بڑھ اور دو قدم کہ یہ ایمن وہ طور ہے

گھٹنا ہی چاہتا ہے گریباں کا فاصلہ
پھر دست شوق دامن جاناں سے دور ہے

ہر مژدۂ نشاط سے محروم کر دیا
ارشاد ہے کہ ہجر میں جینا ضرور ہے

گریہ جوش ندامت بس اب تھمنے کا تو نام نہ لے
جب تک رحمت کا ہر پہلو دل کا دامن تھام نہ لے

دل کی لامحدود فضا میں گم ہو جا یوں آپ کو ڈھونڈھ
ہوش کے بس کا روگ نہیں ہے ہوش سے تو یہ کام نہ لے

راحت کا مفہوم یہی ہے جہد طلب سے باز نہ آ
بڑھنے دے دل کی بے چینی تڑپے جا آرام نہ لے

کافر صورت دیکھ کے منہ سے آہ نکل ہی جاتی ہے
کہنے کیا ہو اب کوئی اللہ کا یوں بھی نام نہ لے

آداب طلب سیکھ طلب بے ادبی سے
مجرم ہے وہ سائل جو در دل پہ صدا دے

کیفیت ظہور فنا کے سوا نہیں
ہستی کی اصطلاح میں دنیا کہیں جسے

اب زندگی ہے نام اسی امید دور کا
ٹوٹے ہوئے دلوں کا سہارا کہیں جسے

کیا ٹھہرے لطافت دل پر گراں نہیں
وہ پیرہن غبار تمنا کہیں جسے

ہے اتصال قطرہ و دریا پہ منحصر
وہ آبروئے قطرہ کہ دریا کہیں جسے

کب تک رہین ذوق تماشا رہے کوئی — اب وہ نگاہ دے کہ تماشا کہیں جسے
دریوزۂ فنا مرے مسلک میں ہے حرام — در پردہ زندگی کا تقاضا کہیں جسے

مژدۂ عیش بہ تمہید پریشانی ہے — للہ الحمد کہ پھر غم کی فراوانی ہے
قطرہ کیا۔ موج کسے کہتے ہیں کیا گرداب — ڈوب کر دیکھ، نہ دریا ہے نہ طغیانی ہے

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی — دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی
محضر ہے یہی قتل شہیدان وفا کا — جلاد کی چتون ہے جو شرمائی ہوئی سی
سنتا ہوں جو آتی ہے صدا پردۂ دل سے — امید کی آواز ہے تھرائی ہوئی سی
درپیش ہے پھر مسئلہ طاقت دیدار — پھر کچھ نگہ شوق ہے گھبرائی ہوئی سی
اک عالم دل ہے یہی دنیا یہی فردوس — ہر شے نظر آتی ہے نظر آئی ہوئی سی

ہوں وہ فریب خوردہ رہبر کہ لاکھ بار — پلٹا کے لے چلا ہے مرا نقش پا مجھے

سامنے آئیں جو ہوں دعوائے تقویٰ والے — چشم ساقی کی ادا میکدہ بردوش ہوئی

مجبوریٔ عریاں کو یہ خلعت مختاری — اللہ رے کرم ہم اور توفیق گنہ گاری

بیداد کا گلہ تو کروں اور جو وہ کہیں — "یہ کہیے امتحان وفا ناگوار ہے"
مختار ہوں کہ معرفت جبر دست ہوں — مجبور ہوں کہ یہ بھی کوئی اختیار ہے

آداب عاشقی کا تقاضا ہے اور بات
تو ورنہ دل کی آڑ میں خود بے قرار ہے

کچھ شرح بیخودی ہے، کچھ ہوش کا فسانہ
یہ بے حسی جو شاید تنقید زندگی ہے

یوں ملی ہر نگاہ سے وہ نگاہ
ایک کی ایک کو خبر نہ ہوئی

اللہ اللہ یہ حسن پرسش حال
کہ مرے حال پر نظر نہ ہوئی

فردوس بداماں ہے ہر نقش خیال ان کا
یہ شان تصور ہے تصویر کو کیا کہیئے

وہ برق کی یورش ہے ہر شاخ میں لرزش ہے
ایسے میں نشیمن کی تعمیر کو کیا کہیئے

یارب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی
لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیئے

جبیں صرف سجود بے جبیں معلوم ہوتی ہے
طبیعت بے نیاز کفر و دیں معلوم ہوتی ہے

نگاہ ناز سوز عشق دونوں ایک ہیں لیکن
کہیں ہوتی ہے یہ بجلی کہیں معلوم ہوتی ہے

نہیں معلوم راہ شوق میں ہے بھی کوئی منزل
جہاں تھک کر نظر ٹھہرے وہیں معلوم ہوتی ہے

مری ہستی کہ ہے بھی اور نہیں بھی ہے خدا رکھے
تیرے پیمان باطل کا یقیں معلوم ہوتی ہے

زمین حشر فانی کیا قیامت ہے معاذ اللہ
مجھے اپنے وطن کی سی زمیں معلوم ہوتی ہے

پھیر لے میت کی جانب سے نگاہ التفات
سینکڑوں شکووں کے نرغے میں لب خاموش ہے

راز آزادی فقط تیرے اسیروں پر کھلا
جو تیرے قدموں پہ سر ہے بے نیاز دوش ہے

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

ہر جلوۂ محسوس کو مرہون نظر کر
آ اور دلِ برباد میں اک حشر بپا کر
حیرت کدۂ ناز میں دل بھی ہے نظر بھی
افسانۂ دل یوں کوئی سنتا نہیں فانی

اس بزم میں ہر شمع کو پروانہ بنا دے
جا اور دلِ آباد کو ویرانہ بنا دے
اب دوست جسے آپ سے بیگانہ بنا دے
اب موت کسی دن مجھے افسانہ بنا دے

گم ہیں رہِ تسلیم میں طالب بھی طلب بھی
سجدہ ہی دریار ہے سجدہ ہی جبیں ہے
کچھ مظہرِ باطن ہوں تو کچھ محرمِ ظاہر
میری ہی وہ ہستی ہے کہ ہو اور نہیں ہے
ایذا کے سوا لذتِ ایذا بھی ملے گی
کیوں جلوہ گہِ ہوش یہاں دل بھی کہیں ہے

تو بھی کر دے غلطی ہائے محبت کو معاف
آہ امید وفا پر ہے پشیماں کوئی
برق نے میرے قفس کو بھی نشیمن سمجھا
آہ ایسا بھی نہ ہو سوختہ ساماں کوئی

موج کیا، گرداب کیسا، کیوں کسی کا نام لوں
خود سفینہ ہی مرا دعوت ہے طوفاں کے لیے
پھر ہوا گو رغبیاں میں بگولوں کا ہجوم
خاک دل اٹھتی ہے تنظیم بیاباں کے لیے
دل کی یہ شوریدگی شبہائے غم اتنی دراز
اہتمام اتنے تری زلفِ پریشاں کے لیے

حکمِ وحشت ہے کہ زنداں کو بھی صحرا جانو
دل وہ آزاد کہ صحرا کو بھی زنداں سمجھے

آہ سے یا آہ کی تاثیر سے
جی بہل جاتا کسی تدبیر سے
جبر کو کیوں کر نہ سمجھوں اختیار
تم نے باندھا ہے مجھے زنجیر سے

دل سراپا نظر۔ وہ حسن تمام — بند کر آنکھ دیکھتا کیا ہے
مدعا ہے کہ مدعا نہ کہوں — پوچھتے ہیں کہ مدعا کیا ہے

ہائے وہ تیرے ذکر میں یہ بھی ہے آرزو کہ کاش
کوئی کہے کہ بزم ناز۔ تو جو نہیں اداس ہے
چل تو رہے ہیں سب مگر۔ ہے کوئی منزل آشنا
مدعیان آرزو۔ دل بھی کسی کے پاس ہے
ترک خودی ہے ہوش عشق۔ درک خودی ہے جوش عشق
خود نشناس و خود شناس جو ہے خدا شناس ہے

دیر میں یا حرم میں گذرے گی — عمر تیرے ہی غم میں گذرے گی
کچھ امید کرم میں گذری عمر — کچھ امید کرم میں گذرے گی
زندگی یاد دوست ہے یعنی — زندگی ہے تو غم میں گذرے گی
اب کرم کا یہ ماحصل ہے کہ عمر — یاد عہد ستم میں گذرے گی
دل کو شوق نشاط وصل نہ چھیڑ — غم میں گذرے ہے غم میں گذرے گی
حشر کہتے ہیں جس کو اے فانی — وہ گھڑی شرح غم میں گذرے گی

تو شمع آئینہ خانہ ہے آئینہ کیا ہے — تری خدائی کے قربان ماسوا کیا ہے
اٹھا بھی دے نگہ ماسوا نگر کا حجاب — یہ دیکھنے ہی کا پردہ ہے دیکھتا کیا ہے
کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ — یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

مر کے ٹوٹا ہے کہیں سلسلۂ قید حیات
مگر اتنا ہے کہ زنجیر بدل جاتی ہے

تجھ سے انکار بن نہیں پڑتا
اپنی ہستی گواہ ہوتی ہے
طاقت ضبط کا سوال نہیں
اب تو ہر سانس آہ ہوتی ہے

لبیک کہا کس کو حیات ابدی نے
دم توڑ دیا کیا ترے قدموں پہ کسی نے
مجموعہ آداب دو عالم ہے محبت
مرنے کے سلیقے ہیں نہ جینے کے قرینے
مرتے ہی بن آتی ہے نہ جیتے ہی بن آتی
مارا مجھے قاتل کی مسیحا نفسی نے
پڑتا نہیں آئینہ میں عکس کوئی اور
دل میں تری تصویر سی رکھ دی ہے کسی نے
آئینہ بصد جلوہ دہر جلوہ بہ صد رنگ
کیا کیا نہ کیا تیری تماشا طلبی نے
دو نام ہیں ہستی و فنا ایک ہی دل کے
مارا ہے اسی دل نے جلایا ہے اسی نے
امید بھی کیا شے ہے کہ ہر سانس میں فانی
کچھ زندگیٔ خضر کے پاتا ہوں قرینے

آہ اب تک تو بے اثر نہ ہوئی
کچھ تمہیں کو مری خبر نہ ہوئی
شام سے فکر صبح کیا شب ہجر
مر رہیں گے اگر سحر نہ ہوئی
حشر کا دن بھی ڈھل گیا فانی
دل کی روداد مختصر نہ ہوئی

اب برق نشیمن کو ہر شاخ سے کیا مطلب
جس شاخ کو تاکا تھا وہ شاخ جلا ڈالی
جینے بھی نہیں دیتے مرنے بھی نہیں دیتے
کیا تم نے محبت کی ہر رسم اٹھا ڈالی
جینے میں نہ اب زنگی مرنے میں شمار اپنا
ماتم کی بساط اس نے کیا کہہ کے اٹھا ڈالی

کس کو کہیے ماسوا جب تم نہیں تو کچھ نہیں
تو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے بزمِ کائنات
جب مزاجِ دوست کچھ برہم نظر آیا مجھے

ادائیں آگئیں کوئے بتاں کی
زباں کٹتی ہے ذکرِ آشیاں پر
حرم میں آہ نکلے ہیں تو فانی

زمیں تک ہے رسائی آسماں کی
تمنا بھی بہت تھی آشیاں کی
یہ کیا کہیے کہ نیت تھی کہاں کی

وہ ہم سے کہاں چھپتے ہم خود ہیں جوابِ ان کا
محمل میں جو چھپتے ہیں۔ چھپتے نہیں محمل سے

ایمانِ محبت کی بجھتی نہیں چنگاری
اٹھتا ہے دھواں اب تک خاکِ حرمِ دل سے

تجھ کو یہ خبر ہوگی ہم کو تو نہ تھی ناصح
پہلے ہی نظر اٹھ کر لڑ جائے گی قاتل سے

گل چیں کے لیے اور نہ گلشن کے لیے ہے
جو گل ہے ترے گوشۂ دامن کے لیے ہے

چل گورِ غریباں میں نہ اس خاک سے بچکر
تیرے ہی جو سمٹے ہوئے دامن کے لیے ہے

مدفن جو سرِ راہ گذر دوست ہے فانی
روز ایک قیامت مرے مدفن کے لیے ہے

مجھے موت کا آسرا دے رہے ہیں
مری زیست کا مدعا ہونے والے
کوئی بے نیازی کی حد بندہ پرور
کسی کے ہو شاید خدا ہونے والے

کیوں رہے بیچ میں یہ واسطۂ حسن قبول
بند کر بابِ اثر میری دعا سے پہلے
میری عادت ہے وفا ان پہ کچھ احسان نہیں
تھا مجھے ذوقِ وفا ان کی جفا سے پہلے

دو گھڑی کے لیے میزان عدالت ٹھہرے
کچھ ادائیں ہیں جنھیں قتل عبث ہے منظور
تم جوانی کی کشاکش میں کہاں بھول اٹھے
ہائے ان کا مری میت پہ یہ عذر تاخیر
دار فانی میں یہ کیا ڈھونڈھ رہا ہے فانی

کچھ مجھے حشر میں کہنا ہے خدا سے پہلے
کچھ سزائیں ہیں جو ملتی ہیں خطا سے پہلے
وہ جو معصوم شرارت تھی حیا سے پہلے
سو گئے تم مرے دامن کی ہوا سے پہلے
زندگی بھی کہیں ملتی ہے فنا سے پہلے

تیری قدرت کا نظارہ ہے مرا عجز گناہ
تو تبسم بھی شریک نگہ ناز ہوا

تیری رحمت کا اشارہ ہے ندامت میری
آج کچھ اور بڑھائی گئی قیمت میری

میرا دل ہے کسی کی یاد کا نام
مسلم پرسش بیمار لیکن

محبت میری ہستی کا نشاں ہے
وہ شان چارہ فرمائی کہاں ہے

مجھی پر ہیں جفائیں چشم بد دور
پھر اب منظور ہے ہنگامۂ برق

خدا رکھے وہ مجھ پر مہرباں ہے
پھر اب قصد بنائے آشیاں ہے

یہ دل حریف تجلی ہی کیوں بنایا تھا
مگر نمود مشیت وجود تھا اپنا
بلا کشوں کا تمہاری بلا کرے ماتم

کہ جب یہ نقش دوئی بن گیا مٹا کے چلے
رضائے دوست کو ہم آئینہ دکھا کے چلے
جو غم اٹھانے کو آئے تھے ہم اٹھا کے چلے

سر نہیں سنگ در تو ہے ترک نہ کر نماز عشق
خاک جبیں سے کام لے سجدہ بے جبیں سہی

دراصل وہ بے حد ذکی۔ حساس اور صاحب بصیرت و فراست تھے۔ ان کی نظرت بلند تھی اس لیے وہ ہمیشہ درگذر سے کام لیا کرتے تھے۔[1]

قاضی عبدالغفار:۔ ان کے شخصی کردار میں خودداری ایک بہت نمایاں اور طاقت ور عنصر ہے۔ انھیں شاعروں میں دیکھا۔ گھر کے صحنوں میں دیکھا۔ تخلیہ میں۔ جب میرے اور ان کے سوا کوئی موجود نہ ہوتا تھا۔ دیکھا بکلیف اور بے تکلفی دونوں حالتیں دیکھیں۔ لیکن وہ جوان کے کردار میں ایک شانِ تمکنت اور خودداری کا دبدبہ دیکھا وہ ایسا تھا کہ ان کے بے تکلف دوست بھی متاثر اور مرعوب ہوا کرتے تھے۔[2]

رشید احمد صدیقی: ——— فانی نے تمام جذبات و حسیات کی ترجمانی کی ہے لیکن ہر جگہ ان کا دل کش انفرادی رنگ جھلکتا نظر آتا ہے۔ اقبال کی مانند انکے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ کبھی محسوس نہیں ہوتا کہ ہم اردو شاعری کی فرسودہ اور پامال شاہراہ سے گذر رہے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ ہو کہ دونوں نے نہایت محنت اور کشادہ جبینی کے ساتھ مختلف زبانوں کا مطالعہ کیا ہے۔ مختلف سوسائٹیاں دیکھی ہیں۔ مختلف مراحل و منازل طے کیے ہیں۔[3]

محمد سبطین احمد: ——— فانی کی نظرت اپنی انفرادیت ہر جگہ نمایاں کرنا چاہتی تھی۔ ان کا طرز بود و باش اور ان کا انداز گفتگو اک شان انانیت رکھتا تھا۔ لباس میں تکلف ہوتا تھا۔ غصہ کبھی نہ آتا۔ بازاری الفاظ یا سوقیانہ کلمے منھ سے نہ نکلتے۔ فانی کی طرز گفت و شنید بڑے خود سروں کو ان کی شخصیت

---

[1] فانی میری نظر میں جگر علی گڑھ میگزین (فانی نمبر)

[2] مقدمہ کلیات فانی۔ قاضی عبدالغفار۔

[3] مقدمہ باقیات فانی۔ رشید احمد صدیقی۔

سن تو لیا ہے حال دل دیکھئے سن کے کیا کہیں
پھر مرے منھ کی بات ہے کیسی ہی دل نشیں سہی

بے ذوق نظر بزم تماشا نہ رہے گی
ایسا بھی کوئی دن مری قسمت میں ہے فانی
منھ پھیر لیا میں نے تو دنیا نہ رہے گی
جس دن تجھے مرنے کی تمنا نہ رہے گی

کم درد جگر ہے یا بہت ہے
پچھتائیں گے آپ دل کو لے کر
جو آپ سے مل گیا بہت ہے
کم بخت غم آشنا بہت ہے

تکلیف جفا بھی کیوں کریں آپ
کیا چاہیئے اور زندگی کو
احسان غم دنیا بہت ہے
مر رہنے کا آسرا بہت ہے

عشق کا نام کیوں کریں بدنام
نگہ شوق کا مآل نہ پوچھ
زندگی تھی عذاب ہو کے رہی
سر بسر اضطراب ہو کے رہی

چشم ساقی کہ تھی کبھی مخمور
خود ہی آخر شراب ہو کے رہی

جل رہے ہیں آج تک دل کے چراغ
طور پر اک شمع جل کر رہ گئی
چن لیا تیری محبت نے مجھے
اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی

حرم و دیر کی گلیوں میں پڑے پھرتے ہیں
بزم رنداں میں جو شامل نہیں ہونے پاتے
موج نے ڈوبنے والوں کو بہت کچھ پلٹا
رخ مگر جانب ساحل نہیں ہونے پاتے

دل تو سب کو تری سرکار سے مل جاتے ہیں
در و جب تک نہ ملے دل نہیں ہونے پاتے

تو کہاں ہے کہ تری راہ میں یہ کعبہ و دیر
نقش بن جاتے ہیں منزل نہیں ہونے پاتے

کوئی چٹکی سی کلیجے میں لیے جاتا ہے
ہم تری یاد سے غافل نہیں ہونے پاتے

تیرا انعام سمجھتا ہوں ان ارمانوں کو
میری کوشش کا جو حاصل نہیں ہونے پاتے

خود تجلی کو انہیں اذنِ حضوری فانی
آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

رسم بے داد و دست عام ہوئی
تلخیٔ زیست بھی حرام ہوئی

مری زندگی کی گھڑیاں تری دھن میں خوب گذریں
مری عمر کیسے کٹتی تری یاد اگر نہ ہوتی

کیوں پس مرگ یہ احسان اٹھائے کوئی
بے کسی کہہ دے جنازے پہ نہ آئے کوئی

کسی کو کیا مرے سود و زیاں سے
گرے کیوں برق بچ کر آشیاں سے

چرا کر دل پلٹ جانا مکرنا
یہ چالیں سیکھ لیں تم نے کہاں سے

بہت سر پیٹتی ہیں آرزوئیں
کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے

چونک پڑتے ہیں ذکر فانی سے
نیند اچٹتی ہے اس کہانی سے

تیری نامہربانیوں کی قسم
لاگ ہے دل کو مہربانی سے

حشر کو بھی ہے دور کی نسبت
چشم بد دور اس جوانی سے

کچھ خبر بھی ہے روٹھنے والے
زندگی روٹھتی ہے فانی سے

چلے بھی آؤ کہ دنیا سے جا رہا ہے کوئی
سنو کہ پھر نہ سنو گے تم التجا میری

خدا نے زہر کی تاثیر بخش دی فانی
ترس گئی تھی اثر کو بہت دوا میری

کچھ کٹی ہمت سوال میں عمر
کچھ امید جواب میں گذری

تمہارا درد تو درماں بنا لیا ہم نے
اب اور سوچئے تدبیر دل دکھانے کی

زمانہ کفر محبت سے کر چکا تھا گریز
تری نظر نے پلٹ دی ہوا زمانے کی

پلٹ پلٹ کے نفس ہی کی سمت جاتا ہوں
کسی نے راہ بتائی نہ آشیانے کی

عشق ہو جب جنوں تو پھر شاد ہو اے دل حزیں
کوئی گلہ اٹھا نہ رکھ کوئی سوال رہ نہ جائے

تاب نظارۂ جلال حشر میں بخش کر مجھے
شان جمال بھی دکھا شان جمال رہ نہ جائے

اب جو ہوا ہوا مآل چھوڑ خدا پہ اندمال
زخم جگر پہ خاک ڈال تیر سنبھال رہ نہ جائے

کچھ بس ہی نہ تھا ورنہ یہ الزام نہ لیتے
ہم تجھ سے چھپا کر بھی ترا نام نہ لیتے

کیا عمر میں اک آہ بھی بخشی نہیں جاتی
اک سانس بھی کیا آپ کے ناکام نہ لیتے

ان کی دل نوازی میں کوئی شک نہیں لیکن ان کی دل نوازی کو لاگ ہے تمنا سے

کا احترام کرنے پر مجبور کر دیتا۔[1]

ماہر القادری: ——— فانی مرحوم خوش پوشاک اور خوش خوراک تھے اوقات کی پابندی کا بہت لحاظ رکھتے۔ مذہبیت ان کی فطرت میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ ایک زمانہ میں نماز اور تلاوتِ قرآن کے بہت پابند تھے مذہبیت کی یہ چنگاری مرتے دم تک اپنا کام کرتی رہی۔ انقلابی نسم کی ملحدانہ شاعری سے ان کو انتہائی نفرت تھی۔ فانی کا خط بہت پختہ اور دیدہ زیب تھا۔ زیادہ تیز لکھنے کے عادی نہ تھے۔[2]

اشعار ذیل سے ان کی انتادِ طبع کا انداز بخوبی ہو سکتا ہے۔

تری جفا کے سوا بھی ہزار تھے انداز — کوئی تو اہلِ وفا کا مزاج داں ہوتا

تو نے دل دے کے بس اک شان ہوس پیدا کی
ان کا بندہ ہے تو نادان وہی شان بھی لا
تجھ کو پھبتا نہیں اسلام کا دعویٰ فانی
ورنہ وہ غیرتِ اسلام بھی لا۔ آن بھی لا

بوئے خزاں سے مست ہیں یا دہیں بہار کیا — ہم تو چمن پرست ہیں، پھول کہاں کے خار کیا

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی — گرداب کی ہر تہ میں ساحل نظر آتا ہے

کیا کروں نازک بہت ہے انکی مرضی کا سوال — ورنہ فانی اس جیئے جانے سے کچھ حاصل نہیں

وہ پائے شوق دے کہ جہت آشنا نہ ہو — پوچھوں نہ خضر سے بھی کہ جاؤں کدھر کو میں

غم کو جو خوشی بنا کے چھوڑے — فانی وہ نصیب چاہتا ہوں

لذت کشِ آرزو ہوں فانی — دانستہ فریب کھا رہا ہوں!

تا عرضِ شوق میں نہ رہے بندگی کی لاگ — اک سجدہ چاہتا ہوں ترے آستاں سے دور

---

[1] تصویر فانی محمد سبطین (احمد علی گڈھ میگزین (فانی نمبر)
[2] فانی مرحوم ماہر القادری علی گڈھ میگزین (فانی نمبر)

فلسفۂ غم۔ اس کی ماہیت اور اہمیت

غم کیا ہے؟ اس کا وجود کیوں ہے؟ اس کا جواب ہر فلسفی اور مفکر اپنے اپنے نقطۂ نظر کے مطابق دے گا۔ زرتشت اس کو خیر و شر یا نور و ظلمت کی آویزش اہرمن کی عارضی فتح سے تعبیر کرے گا۔ یورپ کا خدا مست فلسفی اسپنوزا (SPINOZA) اس کو جزوی یا محدود نقطہ نظر کا نتیجہ بتائے گا۔ ہارڈی اس کو ایک بے رحم اور ظالم نیچر کی کارفرمائی پر محمول کرے گا۔ ایک صوفی کے نزدیک یہ حساس انفرادیت یا پردۂ جدائی کا لازمہ ہوگا اقبال اس کو خودی کی آزمائش اور ارتقائے خودی کی لازمی شرط قرار دے گا۔ ایک ماہر نفسیات بتائے گا کہ یہ ایک فطری جذبہ ہے جو ہماری خواہشات کی تسکین میں موانع پیش آنے سے پیدا ہوتا ہے۔ غرض خواہ غم کی تعبیر کچھ ہی کیوں نہ کی جائے زندگی میں غم کے وجود سے کسی کو انکار نہ ہوگا۔ یورپ کے لذت پرست (HEDONIST) فلسفی جو حصول مسرت کو زندگی کا سب سے بڑا مقصد سمجھتے ہیں وہ بھی اس آب حیات کو اسی ظلمت کی راہ سے ڈھونڈھنے پر مجبور ہیں غم کے کانٹوں سے دامن بچا کر وہ گل مراد تک پہونچنے کی امید کرتے ہیں۔ کچھ لوگ غم کے وجود کے قائل ہوتے ہوئے بھی ہمیں اکثر و بیشتر غم کی اہمیت کے منکر نظر آئیں گے ان میں سے کچھ لوگ تو وہ ہیں جنھوں نے ناز و نعم کی گود میں پرورش پائی ہے۔ عیش و عشرت کے تہقہوں میں آنکھیں کھولی ہیں۔

انھوں نے ہمیشہ زندگی کے روشن رخ کو دیکھا ہے۔ ان کے دل غم کی لذت سے ناآشنا ہیں۔ اس لیے غم کی عظمت سمجھنے سے قاصر ہیں۔ کچھ لوگ عیش و عشرت کی ظاہری رنگینی اور عارضی چمک دمک سے اس قدر مسحور و مرعوب ہو جاتے ہیں کہ اس کو سب کچھ سمجھنے لگتے ہیں اور رات دن اسی کی تلاش میں سرگرداں و پریشاں رہتے ہیں۔ عنقائے مسرت کی تلاش ان کی زندگی کو پرازغم و آلام بنا دیتی ہے اور غم و آلام کی موجودگی انھیں اور بھی مسرت کے لیے بے چین کرتی ہے۔ ان کے علاوہ بڑی تعداد ان لوگوں کی ہے جو غور و فکر کے عادی نہیں۔ وہ دوسروں کو ایک مقصد کے پیچھے بھاگتے دیکھتے رہتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ ان کی زندگی کا بھی یہی مقصد ہونا چاہیئے۔ وہ دوسروں کو مسرت کا دیوانہ اور غم سے بیزار پاتے ہیں۔ لہٰذا وہ بھی اسی نظر سے غم و مسرت کو دیکھنے لگتے ہیں یہ لوگ اپنے کھوکھلے قہقہوں سے اہل غم کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اپنے سطحی معیاروں سے نعمت غم کی تحقیر کرتے ہیں۔

غم زندگی خود نگری کا دوسرا نام ہے۔ غم سنجیدہ تفکر کی دعوت ہے غم ہی سے انسان عرفان نفس اور اندازہ کائنات حاصل کرتا ہے۔ فلسفیانہ تفکر کے آغاز کی تاریخ بھی ہمیں یہی بتاتی ہے کہ انسان نے زندگی کی گتھیوں کو سلجھانے اور رازِ حیات کو سمجھنے کی کوشش اس وقت شروع کی جب وہ موت کی تلخیوں سے دوچار ہوا۔ بچھڑے ہوئے عزیزوں اور دوستوں کے غم نے انسان کو یہ سوچنے پر مجبور کیا کہ زندگی کیا ہے؟ کیوں ہے؟ اس کا آغاز و انجام کیا معنی رکھتا ہے۔ تمام زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسرت کے نشے میں ہمارا ذہن زیادہ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا۔ ہم چیزوں کے ظاہری انداز و سطحی پہلوؤں پر قناعت کرتے ہیں اور ان سے آگے دیکھنے کی کوشش نہیں کرتے۔ لیکن اک ذرا غم کی

شعر و ادب کا ذوق ورثہ میں پایا تھا اس لیے ساتھیوں اور استادوں سے اس موضوع پر اکثر گفتگو رہتی۔ ایک دن کسی نے یہ شعر پڑھا۔

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھتے
پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا

شعر میں معلوم نہیں کون سی کشش تھی کہ میں نے ایک بار۔ دو بار۔ تین بار۔ اور معلوم نہیں کتنی بار اس شعر کو پڑھا اور ہر مرتبہ ایک نیا لطف حاصل ہوا۔ یہ پہلا دن تھا جب میں فانی سے مانوس ہوا۔ ۱۹۴۳ء میں جب علی گڈھ میگزین کا فانی نمبر نکلا تو اتنا شعور نہ تھا کہ اس نمبر کے مندرجہ حقائق کی تہ تک پہونچتا البتہ اسکے اشعار مزے لے لے کر پڑھتا جن اشعار کا مطلب سمجھ میں آگیا ان کا کیا کہنا اور جو سمجھ میں نہیں آئے ان کے بارے میں بقول استاد محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی "معلوم نہیں کہ کتنی بلند بات کہہ دی جو ہم نہیں سمجھے۔" کہہ کر دل کو سمجھا لیا۔ اس عقیدت کے علاوہ میں نے اکثر محسوس کیا کہ فانی کے ساتھ ہمارے نقادوں نے انصاف نہیں کیا خصوصاً اس ترقی پسندی کے دور میں فانی ہمیشہ مورد الزام رہے کسی نے اگر فانی کے فن کی تعریف بھی کی تو اس کے غم سے بیزاری کا اظہار کیا۔ فانی کے غم کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہے کہ ان کا غم انسانی ولولوں اور ترقی کے جذبے کا منافی ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ اس غلط فہمی کو دور کر کے ان کے غم کا درجہ متعین کر دیا جائے۔

پہلے باب میں فانی کی شخصیت کے صرف ان پہلوؤں پر بحث کرنے کی کوشش کی ہے جن کا تعلق براہ راست ان کی شاعری سے ہے۔ یہ باب ان کی زندگی کے حالات کی تفصیل نہیں بلکہ ان کی شاعری کے پس منظر کی طرف اشارہ ہے۔ دوسرا باب، غم کی ماہیت اور اس کی اہمیت پر ہے۔ اس میں مغرب و یورپین

چوٹ دل پر پڑنے دیجیے تو یہی نہ سوچنے والا انسان اب فلسفیانہ گتھیوں میں الجھا ہوا نظر آئے گا۔

غم کے جذبات میں جو شدت اور گہرائی ہوتی ہے وہ خوشی میں نہیں۔ اکثر اوقات یہ محسوس ہوتا ہے کہ خوشی کی لہریں۔ ہماری ذات کی اوپری سطح ہی کو متاثر کر رہی ہیں یا صرف ہمارے ظاہر کو چھو رہی ہیں لیکن غم ہماری روح کی گہرائیوں میں اتر جاتا ہے اور ہماری کل ہستی کو متاثر کرتا ہے۔ غم ایک پائیدہ حقیقت ہے اور خوشی ایک آنی جانی چیز۔ غم اس باغ ہستی کا مستقل رنگ ہے اور مسرت ایک عارضی بہار۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر چیز خوشی اور مسرت کے عارضی وقفوں کے بعد بار بار اپنے اصلی رنگ ہی کی طرف لوٹتی ہے۔ اگر مقدار اور تناسب کے اعتبار سے بھی غور کیا جائے تو خوشی صرف چند خوش نصیبوں کے حصہ میں ملے گی۔ باقی انسانوں کی وسیع اکثریت غم واندوہ سے ہم کنار نظر آئے گی۔

غم میں ایک اجتماعیت ہے۔ غم ایک اہم حیاتیاتی مقصد کو پورا کرتا ہے۔ غم ہمیں دوسروں کی مصیبت میں شریک ہونے کے بعد اس کے درد سے متاثر ہونے کی دعوت دیتا ہے۔ غم انسان کو خود غرضی اور نفس پروری سے دور کرتا ہے ہوس کے شعلوں کو بجھاتا ہے اور اخلاقی حس کو بیدار کرتا ہے غم تزکیہ نفس اور اصلاح حیات کا ذریعہ ہے۔ غم ہی انسان کو حاضر موجود سے بیزار بنا کر ایک بہتر نظام حیات اور ایک بہتر مستقبل کی تعمیر کے لیے آمادہ کرتا ہے۔ اور انقلاب کا راستہ ہموار کرتا ہے انسانیت کے جتنے محسن اور سوسائٹی کے جتنے مصلح گذرے ہیں انھوں نے غم ہی کے مکتب میں تربیت پائی ہے۔ غم کی آنچ ان کے عزم کو آہنی بناتی ہے، انکے کردار میں پختگی پیدا کرتی ہے۔ غم عمل کے منافی نہیں۔ غم انسان کو ادنا منفعتوں اور سطحی مصلحتوں سے بے پروا بنا کر زندگی کے اعلا مقاصد اور اہم قدروں کی طرف متوجہ

کرتا ہے اور احساس فرض کو ابھارتا ہے۔ غم کی شدت ہی میں انسان ایسی ایسی مشکلات کو عبور کر لیتا ہے اور ایسی ایسی آزمائشوں سے گذر جاتا ہے جن کا تصور بھی معمولی حالت میں اس کو لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ ممکن ہے کہ اس موقع پر کہا جائے کہ فراوانی غم ہی کبھی کبھی خودکشی کا باعث بھی ہوتی ہے۔ لیکن یہ غم کا قصور نہیں بلکہ خودکشی کرنے والوں کے ظرف کا قصور ہے۔ اس کے علاوہ اگر غور کیجئے تو یہ مسرت پرستی کا جذبہ ہی ہے جو انسان کو خودکشی کرنے پر آمادہ کرتا ہے مسرت کو زندگی کا مقصد سمجھنے والا انسان جب اپنے مقصود سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ زندگی کو بے قیمت سمجھ کر اس کا خاتمہ کرنے پر تل جاتا ہے لیکن جو لذت غم سے واقف ہے وہ کبھی اس کم ظرفی اور بدذوقی کا مرتکب نہ ہوگا۔

غم اور فلسفہ کے تعلق کے بارے میں اس مضمون کے آغاز میں اشارہ کیا جا چکا ہے۔ یہاں نامناسب نہ ہوگا اگر ہم دنیا کے بعض اہم فلسفیانہ نظریوں یا فلسفیوں کو اپنی تائید میں پیش کریں۔

یونان قدیم کا قنوطی فلسفی ہریکلٹس (HERACLITUS) زندگی کی گہرائیوں میں غم کی موجوں کو جاری و ساری دیکھتا ہے اور پیہم تغیرات سے درس غم لیتا ہے سقراط کا یہ قول آج تک فلسفۂ اخلاق کے نظریوں کا زیب عنوان ہے کہ "میں تلاش مسرت کے مقابلے میں موت کو ترجیح دوں گا"۔ سقراط کی تعلیم کے اس پہلو نے اخلاق کے بعض اہم نظریوں میں نشوونما پائی۔ مثلاً رواقیت (STOICISM) کلبیت (CYNICISM) وغیرہ۔ درد و غم سے ساز اور مسرت کی نفی ان نظریوں کا اہم جز و مشترک ہے۔ جرمن کا فلسفی اعظم کانٹ (KANT) جس نے جدید فلسفہ میں ایک زبردست انقلاب کی بنیاد ڈالی۔ تلاش مسرت کو اپنے اخلاق کا شجر ممنوعہ قرار دیتا ہے اور عیش و عشرت کی فراوانی سے

اخلاقی عظمت کو بے نیاز ثابت کرتا ہے۔ افلاطون تغیرات کی اس دنیا سے جس کو وہ "غیر حقیقی شہود" قرار دیتا ہے وہ غیر مطمئن نظر آتا ہے۔ اور تصورات کی دنیا" کے لیے بے چین۔ نو افلاطونیت کا بانی پلوٹائینس (PLOTINUS) روح انسانی کو وجود حقیقی سے بتدریج ماخوذ مانتا ہے اور اپنے مرکز اصلی کی طرف لوٹنے کی تڑپ کو انسانی زندگی کا ماحصل قرار دیتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں روح انسانی چونکہ اپنے سرچشمہ حیات سے گر کر اس زندگی کے اسٹیج پر پہنچا ہی اس کی پستی اور مصیبت کا باعث ہے پھر اس بلندی پر پہونچنے اور اپنی کھوئی عظمت کو حاصل کرنے کی خواہش اس کو اس زندگی سے غیر مطمئن اور بے زار رکھتی ہے۔ قرون وسطیٰ کے عیسائی فلسفیوں کے یہاں اس عقیدہ نے گناہ اولیں (ORIGINAL - SIN) اور ہبوط آدم (DESCENT OF ADAM) کی صورت اختیار کر لی لہذا اس کی بنا پر کل نسل آدم داغ دار اور ساری انسانی زندگی مصائب اور غم کا مجموعہ قرار پائی۔ دور جدید کے فلسفیوں میں اسپنوزا (SPINOZA) نے عقیدہ جبر سے اپنے فلسفۂ زندگی میں غم اور افسردگی کی آمیزش کی لیکن جرمنی کا مجذوب فلسفی نطشہ (NEITZSCHE) کہتا ہے کہ "تمام ترقی درد کو روحانیت میں تبدیل کرنے کا نام ہے"۔ دور حاضر میں شریعت غم کا پیغامبر جس فلسفی کو بنا تھا وہ آرتھر شوپنہار (SCHOPEN HAUR) ہے

یہاں پر شاید یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ یورپ میں دو گروہ تھے ایک کا مسلک رجائیت تھا اس کا علمبردار لائبنز ہے اور دوسرے کا قنوطیت اور قنوطیت کا نمائندہ شوپنہار ہے۔ لائبنز کا نظریہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ خیر ہے اگر یہاں برائیوں کا کچھ وجود بھی ہے تو اس لیے کہ دنیا مکمل نہیں ہے اور ناقص چیز کی تعریف یہی ہے کہ اس میں کچھ کمی رہ جائے۔ اس کمی کو پورے طور پر تو

نہیں البتہ ایک حد تک دور کیا جا سکتا ہے۔ مکمل طور پر دور اس لیے نہیں کیا جا سکتا کہ کامل ذات صرف خدا کی ہے اگر وہ کائنات کو بھی کامل پیدا کرتا تو یہ اس کی ہم سری کا دعوا کرتی۔ اس کے برخلاف شوپنہار کہتا ہے کہ "دنیا ہیچ است و کار دنیا ہمہ ہیچ"۔ دنیا میں قابل رشک کوئی نہیں۔ قابل رحم بہت ہیں۔ "مشیت بہ نفسہ اندھی اور غیر ذی شعور ہے" اور یہی وجہ ہے کہ وہ اس دنیا میں ایک لمحہ کے واسطے بھی رکنا نہیں چاہتا۔ وہ اس سے فرار اختیار کرتا ہے اس لیے وہ راہبانہ زندگی کی تعلیم دیتا ہے اور اس مسلک میں وہ بدھ مت سے قریب تر ہے۔ جہاں انسان کو ترک دنیا کی تعلیم دی جاتی ہے۔ شوپنہار نے اپنے فلسفیانہ نظام میں کانٹ کی "شے فی نفسہ" (THING-IN-ITSELF) کو ارادہ سے تعبیر کیا اور اس ارادہ کی توجیہ کے ساتھ اس تنوطیت کی بنیاد رکھی جس کے لیے وہ مشہور ہے۔ اس کے نزدیک ارادہ وہ عمل ہے جو خود اپنا مقصد ہے اور عالم اس ارادہ کے اظہار یا تعین کا نام ہے۔ چونکہ ارادہ محرومی و نقدان کے احساس کا دوسرا رخ ہے اس لیے لذت اور اذیت میں تقدم اذیت کو حاصل ہے۔ لذت کی حیثیت محض ثانوی ہے انسان ان آلام سے جو ارادہ کے باعث اس پر نازل ہوتے ہیں صرف اس وقت نجات پا سکتا ہے جب وہ ارادہ کی نفی کرے۔ وہ لکھتا ہے:۔

"زندگی ایک سمندر ہے جو چٹانوں اور گردابوں سے بھرا پڑا ہے انسان انتہائی احتیاط کے ساتھ ان سے کترانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگرچہ وہ جانتا ہے کہ بالفرض وہ اپنی تمام تر جد و جہد اور قابلیت سے اس کو عبور کرنے میں کامیاب ہو بھی گیا تب

بھی اس کوشش میں ہر ہر قدم پر وہ سب سے بڑی مکمل ۔
ناگزیر۔ ناقابل مداوا بربادی کی طرف جا رہا ہے جو موت سے
تعبیر کی جاتی ہے بلکہ وہ خود ہی اپنی کشتی کو سیدھا موت کے منھ
میں جھونکے دے رہا ہے۔ یہ ہے اس کی محنت۔ سفر کی آخری منزل
اس کے لیے یہ راستہ ان تمام چٹانوں سے زیادہ بدتر ہے جن سے
وہ بچ کر آیا ہے۔"

شوپنہاور کا مشہور شاگرد ہارٹمن اس سے پورا اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے کہ
"انسانی زندگی میں مسرت و شادمانی کے ذخیرے سے زیادہ غم والم
کا ذخیرہ ہے۔"

ایک اور فلسفی پیٹرک (PATRICK) بھی غم کی حمایت میں کہتا ہے کہ ہزاروں
لذتیں ایک الم کے برابر کب ہو سکتی ہیں۔ اسی چیز کو فانی دوسرے
انداز سے کہتے ہیں:۔

میری ہوس کو عیش دو عالم بھی تھا قبول　　تیرا کرم کہ تو نے دیا دل دکھا ہوا

زندگی درحقیقت نام ہے موت سے پہلو بچا بچا کر بھاگتے رہنے کا۔ ہماری
ہر سانس موت کے خلاف ایک جنگ ہے۔ وہ موت جو ہر لمحہ زندگی کے سر
پر منڈلا رہی ہے۔ بے وقوف انسان سمجھتا ہے کہ وہ اس طرح موت سے بچکر
نکل جائے گا۔ حالانکہ موت کی حیثیت یقینی ہے۔ جس گھڑی انسان پیدا ہوتا
ہے اس گھڑی وہ موت کا شکار ہو چکا ہوتا ہے۔ البتہ موت اپنے شکار کے
ساتھ کچھ دیر کھیلتی ہے اس کو ہاتھ پیر مارنے کے لیے پوری ڈھیل دے دیتی
ہے اس کو زندگی کہتے ہیں۔

اب یورپ کے فلسفہ سے قطع نظر کر کے اگر ہندوستان کے نظامہائے

فکر پر نظر ڈالیے تو یہاں کے فلسفہ کا مزاج خاص طور سے غم میں رچا ہوا نظر آئے گا۔ ہندوستان کے تقریباً تمام نظامہائے فکر اس بات پر متفق ہیں کہ زندگی میں نہ صرف غم و الم کی فراوانی ہے بلکہ یہ کہ زندگی کی بنیاد ہی غم پر ہے۔ انسان کا نصب العین نجات یا نروان، اس غم سے مکمل آزادی کا نام ہے۔ صرف چارواک (CHARYAK) فلسفی یا ہندی مادیین اس عقیدہ میں مستثنیٰ نظر آتے ہیں۔ لیکن یہ استثنا بھی ہمارے نظریہ کی تائید کرتا ہے۔ یہ مادیین درد و الم کے وجود کے منکر نہیں بلکہ عقیدہ نروان کے مخالف ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ زندگی میں غم سے مکمل رہائی ممکن نہیں۔ مسرت بغیر غم کے ایسا خواب ہے جو کبھی شرمندہ تعبیر نہیں ہوتا۔ بہرحال حدیث غم کی ترجمانی ہندوستانی فلسفہ کا طغرائے امتیاز رہا ہے۔ لیکن اس امتیاز میں بھی جو سب سے منفرد ہے وہ فلسفہ بدھ ہے۔ گوتم بدھ اپنے فلسفہ کی بنیاد جن چار باعظمت صداقتوں پر رکھتے ہیں ان میں سے ایک غم ہے۔ ان کے نزدیک زندگی کی اصل غم میں مضمر ہے۔ ہماری خواہشات اور زندگی سے لگاؤ ہی غم کے محرک ہیں مسرت بھی غم کا ایک پردہ ہے۔ مسرتوں کا عارضی ہونا، ان کی محرومی پر غم کا احساس ان کے کھوئے جانے کا خطرہ اور ان کے دوسرے المناک نتائج ہمارے غموں اور پریشانی میں اضافہ کا باعث ہوتے ہیں۔ اسی طرح ویدانت فلسفہ کے مطابق زندگی ایک فریب یا مایا ہے۔ ہستی مطلق یا برہما سے الگ اس کا کوئی وجود نہیں۔ انسان اپنی جہالت سے اپنے آپ کو ایک مستقل ہستی خیال کرتا ہے اور خواہشات کے پھندے میں پھنس کر اپنے کاموں کے نتیجہ کے طور پر اس مایا جال میں مبتلا ہوتا ہے۔ نروان مایا کے فریب سے رہا ہونے اور وجود مطلق یا برہما کے ساتھ ایک ہو جانے کا نام ہے۔ نروان کی مثال

ایک شعور محض یا بے خواب نیند کی سی ہے جس میں خلش یا کسی درد کی آمیزش نہیں۔ لیکن جب تک شعور حیات اور زندگی سے لگاؤ باقی ہے۔ درد و غم کی خلش سے رہائی ممکن نہیں۔ ایران قدیم کا فلسفہ بھی زندگی کے تاریک پہلو کو تسلیم کرنے میں کسی سے پیچھے نہیں۔ زرتشت اور اس کے متبعین (زندیق اور منع فلسفیوں کا گروہ نیز مانی و مزدک) بدی اور درد و غم کی تشریح کے لیے کائنات میں ایک ظلمت یا اہرمن کا وجود تلاش کرنے پر مائل نظر آتے ہیں۔

عیسائی اور مسلمان متصوفین بھی غم کی گہرائی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تصوف اور غم میں ایک گہرا تعلق نظر آتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ تصوف نے اپنی ارتقا میں جن فلسفیوں کا براہ راست یا در پردہ اثر قبول کیا ان کے خمیر میں غم پوشیدہ تھا۔ مثلاً نو فلاطونیت۔ فلسفہ ویدانت فلسفہ بدھ وغیرہ۔ اس کے علاوہ تصوف کی بنیاد ہی ایسے وجود مطلق کے تصور پر ہے جو تمام مظاہر کی اصل ہے۔ اس اصل سے واصل ہونا ہی صوفی کی سب سے بڑی تمنا اور اس سے جدائی اس کی سب سے بڑی مصیبت ہے چونکہ یہ مظاہر کی دنیا ہی احساس جدائی کا باعث ہے اس لیے اس کی حیثیت ایک رنج و محن کے قید خانے کی سی ہے جو روح کو اس کی اصل اور اس کے محبوب حقیقی سے جدا کیے ہوئے ہے۔

بشنو از نے چوں حکایت می کند وز جدائی ہا شکایت می کند

اس بحث سے ہمارا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ فلسفہ غم ہی تنہا فلسفہ ہے جس کی ہر فلسفی نے پاسداری کی ہے یا یہی صحیح فلسفہ ہے لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ غم میں کوئی تو ایسا پہلو ہے جس نے بار بار ہر ملک اور ہر زمانے کے بڑے فلسفیوں کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے۔

انگریزی شاعروں میں شیکسپیئر (SHAKESPEAR) ان لوگوں میں سے نہیں ہے جنھوں نے فلسفہ غم کی تبلیغ کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی ہے۔ تاہم اس کے چار شاہکار ڈراموں (LEAR MACBETH, HALET اور (OTHELLO) میں زندگی کا ایک ٹریجک نظارہ ملتا ہے۔ مایوسی اور ناکامی کے مضامین کو شاعر نے ان چار ڈراموں میں جس قدرت اور کمال کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی بحث میں شیکسپیئر کے ٹریجک تصورات کو جگہ دیں۔ احساس و فکر کے جو نتائج شیکسپیئر کے ان ڈراموں میں موجود ہیں بجائے خود اہم ہیں۔ اور اہل غم کے نظریات کی تاریخ میں ایک ممتاز جگہ پانے کا حق رکھتے ہیں۔ ان ڈراموں میں شاعر کا قائم ہیرو کی شخصیت اور کہانی کے انجام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہیرو کی شخصیت کے بنیادی اجزا وہی ہیں جن سے ارسطو نے بحث کی تھی۔ اور جن پر اس معلم اول سے متاثر ہو کر متاخرین ایمان لے آئے تھے۔ شیکسپیئر کی عظمت کا راز اس رومانی طرز نظر میں پوشیدہ ہے جو ارسطو کے یہاں مفقود ہے۔ رومانٹک طرز نظر کی کوئی اٹل منطقی تعریف تو مشکل ہے البتہ یہ محسوس کرنا چنداں مشکل نہ ہوگا کہ رومانٹک شاعر انسانیت کے اسرار کو زیادہ اچھی طرح سمجھتا ہے۔ چنانچہ شیکسپیئر بھی آدمی شناسی کی بدولت اس مقام پر فائز ہے۔ بظاہر یہ بات متناقض معلوم ہوتی ہے۔ لیکن شیکسپیئر کے ٹریجک تصور کی وسعت اور دور رسی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ انسان جو کائنات میں اشرفیت کا مرتبہ رکھتا ہے اسی کائنات کے قوانین میں پھنس جاتا ہے اور محرومی و ناکامی کا شکار ہو جاتا ہے۔ یہ ناکامیاں ہی دراصل اس کے ڈرامے کی جان ہیں۔ ناقدین کا خیال ہے کہ اس نے ڈرامے اس وقت لکھے جب

حالاتِ زندگی نے دنیا کو اس کی نظر میں تنگ و تاریک بنا دیا تھا۔ اس کے یہ ڈرامے اس وقت کی تخلیق ہیں جب خود اس کا دل درد آشنا ہو چکا تھا اور یہی اس کی شہرت کا راز ہے۔ اس سلسلہ میں ایک اہم نام لکریشس (LUCRETIUS ۹۸-۹۵ ق۔م) کا سامنے آتا ہے۔ اس نے اپنی شہرہ آفاق نظم حقیقت اشیاء میں فلسفہ ابیقوریت کو پیش کیا ہے اور اپنے عہد کی سائنس اور فلسفہ کے دقیق مسائل کو شاعری کی زبان میں ادا کیا ہے۔ لکریشس نظریہ سالمات، کا قائل ہے اور عالم کے مظاہر میں کسی عقلی یا ارادی نظام کو تسلیم نہیں کرتا۔ جہاں تک تشائم اور اہل تشائم کے تعلق کا سوال ہے لکریشش کی نظم کو اہمیت اس لیے حاصل ہے کہ اس میں کائنات کے حسن و جمال کے شاعرانہ احساس کے ساتھ وجودِ عالم کے بے مقصد اور مجبور حوادث ہونے کا ایسا فلسفیانہ عقیدہ بھی شامل ہے جو انسان کے دل و دماغ پر چھا جاتا ہے اور اپنے مرشد ابیقورس (EPICURUS) کی صحیح اسپرٹ کو لکریشس، گرگ گرد آلودگی تلاش کرتا ہے اس لیے کہ اس سے مفر نہیں۔

اس سلسلہ میں ٹامس ہارڈی کا نام ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ جرمنی کے فلسفی شوپنہاور سے کافی متاثر تھا اس کے ناولوں میں انسان اور فطرت کے باہمی تعلقات کا جو تصور ملتا ہے وہ المیت اور تشائم سے لبریز ہے۔ اس کے ناولوں میں جو افراد پیش کیے گئے ہیں وہ ماحول کے محکوم اور مجبور ہیں۔ ہارڈی اپنی تحریر کو کمال تاثیر و معنویت سے آراستہ کر لیتا ہے جب وہ دکھاتا ہے کہ کس طرح انسانوں کے منصوبے بے رحم اتفاقات کی بدولت خود انسانی سیرت کے مخفی لیکن اٹل موروثی خصوصیات کی کارگذاری سے خاک میں مل جاتے ہیں۔ جس قدر کامیابی کے ساتھ مصنف کہانی کے ستم رسیدہ افراد کی ہمدردی کے لیے

استحقاق ثابت کرتا ہے۔ اسی نسبت سے پڑھنے والے انسانی حوصلوں کے زوال و شکست پر تاسف میں مبتلا ہوتے ہیں۔ شوپنہاور کا دریافت کیا ہوا ارادہ ہارڈی کے ناولوں میں ایک طاقت کی شکل میں نظر آتا ہے اور یہ طاقت بے پناہ اٹل اور اندھی ہے۔ اس کو انسان کے حسین خوابوں اور رنگین امیدوں سے بیر ہے وہی لمحہ ہارڈی کے ہیرو یا ہیروین سے مقدر کے برگشتہ ہو جانے کا لمحہ ہوتا ہے جب ان کے دیرینہ مقاصد اور تمناؤں کی تکمیل قریب نظر آتی ہے۔ یہی وہ منزل ہے جہاں ہارڈی اپنے نقطۂ عروج پر نظر آتا ہے۔

ایرانی شعرا کے ذخیرہ کلام پر نظر ڈالیے تو وہاں بھی یہی حقیقت کارفرما نظر آئے گی۔ وہاں یورپ کے مکاتب فلسفہ کا بعینہٖ عکس تو نظر نہیں آتا، تاہم ایرانی شعرا کے یہاں بھی فلسفۂ غم کی تفسیریں نمایاں ہیں۔ ایرانی شعرا کو قطعی طور پر رجائیت یا قنوطیت کے الگ الگ خانوں میں تو نہیں بانٹا جا سکتا البتہ فارسی شاعری کا شاہکار ذخیرہ وہی ہے جو حقیقت غم کی ترجمانی کرتا ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور بے وفائی۔ زندگی کی ناپائیداری عیش و عشرت کی گریزپائی۔ آسمان کی شکایت سیہ بختی اور تیرہ روزگاری کا رونا وغیرہ کتاب الم کی تفسیریں نہیں تو کیا ہیں؟ اس موقع پر اہمیت غم کے متعلق پروفیسر مسعود حسن رضوی کا اقتباس بے محل نہ ہوگا۔ فرماتے ہیں۔

"اک رہا غم تو وہ خوشی سے کہیں بہتر موضوع ہے اس لیے کہ خوشی انسان کے پست جذبات کو متحرک کرتی ہے اور غم بلند ترین حسیات کو بیدار کرتا ہے۔ طربیہ کے مقابلہ میں المیہ کی فضیلت کا یہی راز ہے۔"[1]

---

[1] ہماری شاعری، پروفیسر مسعود حسن رضوی

مفکروں، ناقدوں اور فلسفیوں کے نظریات سے بحث کی گئی ہے جو انھوں نے غم کے بارے میں قائم کیے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی فارسی اور اردو شعرا کے یہاں جو غم کے تصورات پائے جاتے ہیں ان پر بھی سرسری نظر ڈالتا ہوا چلا گیا ہوں۔ تیسرا باب ان کے فلسفہ غم و عشق، سے متعلق ہے، فانی کے یہاں غم کس راہ سے آیا؟ ان کے یہاں غم کی کیا نوعیت ہے؟ اس غم کے داخلی اور خارجی اسباب کیا ہیں؟ یہ اور اس قسم کے دوسرے سوالوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔ چوتھا باب فانی کے تصوف سے متعلق ہے۔ یہ ایک الگ حیثیت بھی رکھتا ہے اور تیسرے باب کا ایک جزو بھی ہے۔ اس لیے کہ فانی کے یہاں غم، غم عشق اور خصوصاً عشق الٰہی سے عبارت ہے۔ مگر اس کے ساتھ فانی کا تصوف میر اور درد کے تصوف سے بہت مختلف ہے۔ یہ تمام مباحث ہیں جن پر اس باب میں روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پانچواں باب فانی میر اور غالب، نہایت فرسودہ عنوان ہے مگر غم اور فلسفہ کے ذکر کے ساتھ ان تینوں کا ذکر ناگزیر تھا۔ بغیر کسی موازنہ کے صرف یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تینوں کے یہاں غم کے کون سے راستے ہیں۔ کہاں تک ان کا غم آپس میں ہم آہنگ ہے اور وہ کون سی منزل ہے جہاں ان کے راستے جدا ہو جاتے ہیں۔ چھٹا باب فانی اور معترضین کے عنوان سے عبارت ہے۔ مختلف اوقات میں فانی پر مختلف قسم کے اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ اس باب میں ان کا جواب دیا گیا ہے اور اس طرح ان بہت سی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو مورخین فانی پر کرتے رہے ہیں۔ ضمیمہ اول میں فانی کے یہاں ایسے الفاظ اور تراکیب کی نشان دہی کی گئی ہے جو عام نہیں ہیں یا فانی نے ان کو زیادہ سلیقہ سے برتا ہے۔ اسی کے ساتھ ایسے الفاظ بھی شامل کر دیے گئے ہیں جو فانی کے یہاں

ممکن ہے کوئی معترض کہے کہ ایک فلسفی کے لیے غم کا وجود ناگزیر ہے لیکن ادیب یا شاعر کو کیا حق ہے کہ وہ اپنے اندوہ گیں نغموں سے ہمارے لمحات کو منغص کرے اس اعتراض کا جواب بہت آسانی سے دیا جا سکتا ہے ۔ اول تو آرٹ اور شاعری کا تعلق ہماری زندگی سے ہے اور یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ زندگی میں غم کا حصہ خوشی سے زیادہ ہے اس لیے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ غم کے نغمے خوشی کے ترانوں سے زیادہ زندگی کے ترجمان ہیں غم کی وسعت سے قطع نظر اگر ایک شخص کے تجربات زندگی اس کو غم ہی سے روشناس کرتے ہیں تو اس سے ہم عیش کے نغموں کی توقع کیوں کریں اس کے علاوہ ایک عجیب بات ہے کہ آرٹ میں غم سے جو دلکشی و رعنائی پیدا ہوتی ہے وہ عیش و مسرت سے نہیں ۔ یہی وجہ ہے کہ ارسطو اپنے نظریۂ آرٹ میں ٹریجڈی کو کامیڈی پر فضیلت دیتا ہے ۔ ارسطو کے نزدیک ٹریجڈی کی دلکشی کا راز یہ ہے کہ وہ ہمارے گھٹے ہوئے جذبات، غموں اور مایوسیوں کو نکاس کا موقع فراہم کرتی ہے اور روحانی تزکیہ کا ذریعہ بنتی ہے ۔ یہی سبب ہے کہ مرثیوں میں قصیدوں سے زیادہ تاثر پایا جاتا ہے۔ ہنر آرٹ بالخصوص شاعری کا جو تعلق جذبہ محبت سے ہے وہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے اور محبت و غم لازم و ملزوم ہیں ۔

ناز پرورد تنعم نبرد راہ بدوست   عاشقی پیشۂ رندان بلاکش باشد

یہی وجہ ہے کہ محبت کی چوٹ یا غم سے متاثر ہو کر شعرا نے اپنے شیریں ترین نغمے سنائے ہیں اور اپنے خون جگر سے بہترین معجز ہائے ہنر کی تخلیق کی ہے اس حقیقت کو شیلی یوں بیان کرتا ہے

"ہمارے شیریں ترین نغمے وہ ہیں جو سب سے المناک خیالات کی ترجمانی کرتے ہیں ہماری سب سے پر خلوص ہنسی میں کچھ درد مضمر ہوتا ہے۔"

بقول پروفیسر مسعود حسن رضوی :۔

"یہ ایک تعجب انگیز حقیقت ہے کہ ہم غم سے بچنا چاہتے ہیں مگر داستان غم کو بڑی دلچسپی سے سنتے ہیں۔"

اگر مختلف زبانوں کے بہترین ادیبوں اور شاعروں کی فہرست تیار کیجئے تو یہ حیرت انگیز انکشاف ہوگا کہ ان میں سے اکثر کے یہاں اپنے طور پر غم ہی کی ترجمانی ملتی ہے۔ حافظ کی سرمستی میں بھی ایک گہری غم کی لہر جاری و ساری نظر آتی ہے۔

صبا بہ لطف بگو آں غزال رعنا را — کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادۂ ما را
در کوئے نیک نامی ما را گذر ندادند — گر تو نمی پسندی تغیر دہ قضا را

خیام کے متعلق اکثر کو غلط فہمی ہے کہ وہ مادیت اور فلسفہ ابیقوریت کا قائل ہے اس لیے اس کی شاعری میں عیش و مسرت کے نغمات ہوں گے۔ لیکن اس کی حکیمانہ نظر اس سطحیت کی مرتکب نہیں۔ وہ مے و مستی کی تلقین ضرور کرتا ہے۔ لیکن عقیدہ جبریت اور اس سے پیدا ہونے والی تنوطیت سے فرار کے طور پر وہ کہتا ہے۔

برخیز و بیا بتا برائے دل ما — حل کن بہ جمال خویشتن مشکل ما
یک کوزہ مے بیار تا نوش کنم — زاں پیش کہ کوزہ ہا کنند از گل ما

یا ایک اور جگہ اس یقین کو دہراتے ہیں کہ زندگی 'یک نفس' سے زیادہ نہیں ہے۔

از مرحلہ کفر تا بہ دیں یک نفس است — وز عالم شک تا بہ یقیں یک نفس است
ایں یک نفس عزیز اں خوش می دار — چوں حاصل عمر ما ہمیں یک نفس است

اس قسم کے خیالات عمر خیام کے یہاں بکثرت ملیں گے۔ فارسی شعرا کے یہاں

غم والم ایک مسلّم اور ناقابل تردید حقیقت ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ وہ اس حقیقت سے گریز کرنے کے واسطے مطرب و جام کا سہارا لیتے ہیں لیکن فلسفہ کی تہ میں وہی غم کارفرما ہے۔ حافظ کا شعر ہے۔

اگر غم لشکر انگیزد کہ خون عاشقاں ریزد
من و ساقی بہم سازیم و بنیادش براندازیم

یہاں پر یہ بات قابل غور ہے کہ غم کے متعلق اہل مغرب کا رویہ ایرانی نظریہ سے بہت قریب ہے۔ مغربی شاعر رومانی فضا میں غم والم حیات سے پناہ ڈھونڈھتا ہے اور ایرانی شاعر تلخی غم سے بچنے کے لیے مطرب و جام و مینا کے سہارے تلاش کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی اور ایرانی شاعری میں غم والم کی ایک چھپی ہوئی لہر تو پائی جاتی ہے مگر غم کو گلے لگانے کا سلیقہ یا زہر غم میں ڈوبے ہوئے میر و فانی کے سے نشتر معدوم ہیں۔ یاسیات کا عنصر ہماری اردو شاعری میں بدرجہ اتم موجود ہے اور خصوصیت کے ساتھ میر اور فانی کی نشتریت سے کون واقف نہیں۔ اس اعتبار سے اردو شاعری کی حیثیت منفرد اور ممتاز نظر آتی ہے کہ یاسیت اپنے اصلی نکھار کے ساتھ کارفرما ہے یہی وجہ ہے کہ جو اثر اردو المیہ شاعری میں ہے اور کسی شاعری میں نہیں ہے۔ اردو شاعری میں سودا پر میر کو۔ انشا پر مصحفی کو۔ ناسخ پر آتش کو اور ذوق پر غالب کو جو برتری حاصل ہے اس کا راز بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ انشاء اللہ خاں جب اپنی پھکڑپن اور ہنسوڑپن چھوڑ کر لذت غم سے واقف ہوتے ہیں جب ہی ان کی شاعری میں درد و اثر پیدا ہوتا ہے چنانچہ ان کی غزل ع نہ چھیڑ اے نکہت باد بہاری الخ سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ میر، مصحفی، آتش اور فانی وغیرہ کے یہاں تو غم کے نغمے انکی زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں لیکن اقبال جن کو ایک پیامی شاعر اور شاعر فردا کہا جاتا ہے ان کا دامن بھی غم کی گلکاری سے مزین نظر آتا ہے حقیقت میں اعلا نصب العین رکھنے والا

جذبات کی سطحیت کا مرتکب نہیں ہوسکتا نصب العین کی جتنی تڑپ اسکے دل میں ہو گی اتنا ہی وہ موجودہ حالات سے بے زار اور غیر مطمئن نظر آئے گا یہ اور بات ہے کہ اس کا غم شخصی ہونے کے بجائے ملی یا اجتماعی ہو۔ ابتدائی شاعری میں ان کا غم کچھ چھپا اور دبا ہوا سا ہے لیکن آخر میں ضبط کا بند ٹوٹتا ہے اور غم کا لہجہ ان کی تمام شاعری پر چھا جاتا ہے۔ ارمغان حجاز اور مثنوی پس چہ باید کرد ہم اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کر سکتے ہیں۔ آخر الذکر تصنیف میں اقبال اپنے متعلق یوں اظہار خیال کرتے ہیں۔

بندۂ چوں لالہ داغ در جگر — دوستانش از غم او بے خبر
بندۂ اندر جہاں نالاں چو نے — تفتہ جاں از نغمہ ہائے پے بہ پے
در بیاباں مثل چوب نیم سوز — کاروان بگذشت و من سوزم ہنوز
جاں ز مہجوری بنالد در بدن — نالۂ من وائے من اے وائے من

اقبال اپنی بالکل ابتدائی شاعری داغ اور دوسرے شعرا کے زیر اثر رسمی انداز میں شروع کرتے ہیں لیکن بہت جلد ان کا غم آشنا دل قومی درد سے متاثر ہو کر آنسو بہانے لگتا ہے۔ نالۂ یتیم، صدائے درد وغیرہ اس دور کی ترجمانی کرتے ہیں۔ پھر جب ان کی نظر زیادہ سنجیدہ ہوتی ہے تو ان کا فلسفیانہ تجسس ان کو راز حقیقت کی جستجو میں بے چین کرتا ہے تو یہ کرب و اضطراب ان کی شاعری میں بھی نمایاں نظر آنے لگتا ہے "شمع و شاعر" رات اور شاعر والدہ مرحومہ کی یاد میں حقیقت حسن۔ ہمارے دعوے کے ثبوت میں کافی ہیں۔

آہ یہ دنیا۔ یہ ماتم خانۂ برنا و پیر — آدمی ہے کس طلسم دوش و فردا میں اسیر
کتنی مشکل زندگی ہے کس قدر آساں ہے موت — گلشن ہستی میں مانند نسیم ارزاں ہے موت

.. ..

آہ غافل موت کا راز نہاں کچھ اور ہے
نقش کی ناپائداری سے عیاں کچھ اور ہے

جنتِ نظارہ ہے نقش ہوا بالائے آب
موج مضطر توڑ کر تعمیر کرتی ہے حباب

موج کے دامن میں پھر اسکو چھپا دیتی ہے یہ
کتنی بیدردی سے نقش آسا مٹا دیتی ہو یہ

پھر نہ کر سکتی حباب اپنا اگر پیدا ہوا
توڑنے میں اسکے یوں ہوتی نہ بے پروا ہوا

یہاں تک کہ وہ اپنے فلسفیانہ سفر کی منزل تک پہونچ جاتے ہیں یہاں ان کو زندگی اور حقائق کائنات کے راز منکشف ہوتے ہیں۔ اب ان کی تڑپ اور درد والم ایک دوسرے انداز میں ظاہر ہوتا ہے۔ نصب العین پر پورا ایمان اور یقین ان کے دل میں تڑپ اور دردمندی کا اضافہ کر دیتی ہے۔ انھیں اس بات سے تاسف و حسرت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی کا آفتاب غروب ہونے کے قریب آگیا اور وہ اپنی جد و جہد اور عملی صلاحیتوں کو اس نصب العین کے حصول کی راہ میں صرف نہ کر سکے۔ نیز انھیں اس بات کا بھی غم ہے کہ ان کی قوم ابھی خواب غفلت ہی میں آسودہ ہے اور اس کے نوجوان اس غم اور جذبہ سے ناآشنا ہیں جو خود اقبال کو شب و روز بے چین رکھتا ہے۔

جوش کی شاعری عام طور پر محض وقتی مسرت اور لذت پرستی کی شاعری سمجھی جاتی ہے جہاں کہیں وہ ناصح یا واعظ کا جامہ اختیار کرتے ہیں تو ان کو زیب نہیں دیتا اور ان کا لہجہ نامانوس معلوم ہونے لگتا ہے لیکن ان کی شاعری بھی ان ہی محلوں میں فن کی انتہائی بلندیوں پر نظر آتی ہے جن میں وہ غم کی ترجمانی کا حق ادا کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "نوبہار ہستی" کو لیجئے۔ جوش کی عام نظموں کے برخلاف جس کا اثر وقتی اور ہلکا ہوتا ہے اس نظم کو جتنی بار پڑھیے اس کی خوبی اور کشش بڑھتی جاتی ہے۔ یہ اسی سنجیدہ غم کی کیفیت کا اثر ہے جس سے یہ نظم بھرپور ہے۔ اسکے علاوہ ان

کہ یہ اشعار پڑھیے ان میں آپ کو ایک بے چین اور بے قرار روح کے ساتھ مزاج شعری کی بلندی بھی نظر آئے گی۔

ہر سانس میں قانون سزا جاری ہے ہستی نہیں اک قسم کی بیماری ہے
انسان پہ یہ زندگی ہے اک قہر خدا بیمار پہ یہ رات بہت بھاری ہے

ہر بات میں تیغ خوں چکاں ہے یارب ہر پاؤں میں زنجیر گراں ہے یارب
مذہب کی برادری سے دل تنگ ہوئیں انساں کی برادری کہاں ہے یارب

جدید ترقی پسند شعرا جو اصولی طور پر قنوطیت کے دشمن ہیں۔ وہ بھی جذبات غم سے اپنی شاعری کو نہیں بچا سکتے۔ فیض۔ جذبی۔ مجاز اور سردار کا طبعی میلان اسی طرف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ کوئی حقیقی شاعر مقصود و موجود کی کشاکش یا ماحول کی تلخیوں سے بے نیاز اور بے حس نہیں رہ سکتا۔ دور حاضر کی شاعری میں سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کے یہاں واردات حسن و عشق کے ساتھ دوسرے اہم سماجی اور معاشرتی حالات بھی ملتے ہیں۔ ان کا غم ذات کا بھی ہے اور کائنات کا بھی۔ کبھی سماج کی اس ناآسودگی کی بنا پر اور کبھی سیاست کے انتشار کے نتیجہ پر غم کا اظہار ہوگا۔ یہاں غم کا دائرہ وسیع بھی ہے اور انوکھا بھی۔ کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ذات، کائنات، سیاست اور سماج یہ سب ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے ہیں اور کسی کو ایک دوسرے سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ یہاں ہم صرف چند اشاروں پر اکتفا کریں گے۔

فیض کو اپنے دیس اور اس کے رہنے والوں کی خستہ حالی۔ قوم کی عزت و ناموس کی رسوائی۔ جہالت۔ بھوک کا احساس شدید ہے اس کا نصب العین اجتماعی ہے مگر وہ اجتماعی جذبات کو شخصی غم میں دکھاتا ہے

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل نے یہ سمجھا — کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے — کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہوگی

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد — کوچۂ یار سے بے نیل مرام آتا ہے
ہر کوئی شہر میں پھرتا ہے سلامت دامن — رندِ میخانے سے شائستہ خرام آتا ہے

فیضؔ کے یہاں لہجے کی دردناکی اور فضا کی نرمی ایک خاص چیز ہے اس میں رومانیت نے ایک ایسی کسک پیدا کر دی ہے جو عاشق کا مزاج بن جاتی ہے۔

تمھارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک — جہاں میں باقی ہو دلداریٔ عروسِ سخن
تمھارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہو فلک — تمھارا دم ہو تو دم سازِ ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں آلام — تمھاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایام
سلام لکھتا ہے شاعر تمھارے حسن کے نام

موجودہ دور کے یاس پسندوں میں سب سے اہم نام جذبی کا آتا ہے ان کی یاسیت تغزل کی وجہ سے رومانی یاسیت بن گئی ہے۔ حسن و عشق کی واردات میں غم کی لے نمایاں ہے ان کے یہاں عیش وصال بھی آنے والے ہجر میں سوگوار نظر آتا ہے۔

جب کبھی کسی گل پر اک ذرا نکھار آیا — کم نگاہ یہ سمجھے موسمِ بہار آیا

ان پر فانی کے رنگ کا اثر نمایاں ہے گو فانی کے فلسفہ اور تصوف سے ان کا مذاق بیگانہ ہے۔ جذبی کے یہاں بھی زندگی اور موت کی کشمکش نظر آتی ہے اور اس کشمکش میں وہ موت کے طلبگار نظر آتے ہیں۔

ہم نے غم کے ماروں کی محفلیں بھی دیکھی ہیں ایک غم گسار اٹھا اک غم گسار آیا
یوں تو سینکڑوں غم تھے پر غم جہاں جذبی بعد ایک مدت کے دل کو ساز گار آیا

وہی جفائیں وہی سختیاں، وہی آفات تمھیں بتاؤ کہ بدلے کہاں مرے دن رات

عذاب درد پہ نازاں ہیں اہل درد مگر نشاط درد میسّر نہیں تو کچھ بھی نہیں

جذبی شخصی غم میں مبتلا ہیں مگر اجتماعی احساس سے بیگانہ نہیں۔ یہی سبب ہے کہ شخصی غم میں اجتماعی غم کی آمیزش بھی ہے۔ دوسروں کے مقابلہ میں جذبی کے یہاں غم کے نشتر زیادہ تیز ہیں۔

مجاز کی طبیعت باغیانہ ہے۔ مذہب، سیاست۔ سماج، غرض ہر چیز سے بغاوت کے اثرات اس کے یہاں نمایاں ہیں۔ یہ بغاوت دراصل اسکی ناآسودگی سے پیدا ہوئی ہے۔ محبت کی ناکامیوں اور زندگی کی تلخیوں نے مجاز کو ہر چیز سے باغی بنا دیا۔ سماج کا باغی اس لیے ہے کہ سماج نے اس کی خواہشات کا احترام نہیں کیا۔ سیاسیات سے اس لیے متنفر ہے کہ جس نئے نظام کا خواب اس نے دیکھا تھا اس کی تعبیر یہ نہیں ہے۔ مذہب سے بیزاری اس لیے ہے کہ اس کے دعوے داروں کا روپ بڑا مکروہ اور بھیانک ہے غرض اس بے قراری اور بے چینی نے اس کو ایسے سمندر میں پھینک دیا جہاں تلخیوں اور مصائب کے تھپیڑے تھے۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے لہجہ میں تلخی پیدا ہو گئی۔

جی میں آتا ہے یہ مردہ چاند تارے نوچ لوں
اس کنارے نوچ لوں اور اس کنارے نوچ لوں

ایک دو کا ذکر کیا سارے کے سارے نوچ لوں
اے غم دل کیا کروں۔ اے وحشت دل کیا کروں

اک لپکتا ہوا شعلہ ہوں میں ایک چلتی ہوئی تلوار ہوں میں

مجاز کی طرح سردار جعفری بھی باغی ذہن رکھنے والوں میں ہے۔ مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ مجاز کی رومانیت نے اس تلخی کو مدھم بنا دیا ہے۔ مگر سردار کی یلغار اس رومانیت سے محروم ہے۔ زندگی کی آسودگیوں نے سردار کے باغیانہ فکر کو مصلحت اندیشی بھی بخش دی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے یہاں اگرچہ غم کی وہ شدت اور المیہ کی وہ تیزی نہیں ہے جو مجاز کے یہاں ہے۔ اور نہ غزل کا وہ دھیما پن اور سوز و گداز ہے جس نے جذبی کی شاعری کو تہ دار اور تیز بنا دیا ہے۔ تاہم اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ بھی زندگی کی ان بدلتی ہوئی قدروں سے مطمئن نہیں۔ اس بے اطمینانی کے غم کا اندازہ سردار کے ان اشعار سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

یقیں کا ذکر ہی کیا ہو کہ اب گماں بھی نہیں
مقام درد نہیں، منزل فغاں بھی نہیں

وہ بے حسی ہے کہ جو قابل بیاں بھی نہیں
کوئی ترنگ ہی باقی رہی نہ کوئی امنگ

جبین شوق نہیں، سنگ آستاں بھی نہیں
رقیب جیت گئے، ختم ہو چکی ہے جنگ

دلوں میں شعلۂ غم بجھ گیا ہے کیا کیجئے
کوئی حسین نہیں کس سے اب وفا کیجئے

سوائے اس کے کہ قاتل ہی کو دعا دیجئے

زندگی کا ڈرامہ اگر تمام تر المیہ نہیں تو کم از کم غم و الم اس کے اہم اور غالب اجزا کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایک عظیم شاعر یا ادیب جتنا زیادہ حساس ہوگا اتنا ہی غم کا ترجمان ہوگا۔ مختصر یہ کہ غم نہ صرف زندگی کا ایک ناقابل تردید پہلو ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو کائنات میں جاری و ساری ہے

راز کونین خلاصہ ہے اس افسانے کا

فانی کا غم اور عشق

جب ایک شاعر کو پے بہ پے ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور اس کی ہر امید مایوسی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جب اس کی زندگی موت بن جاتی ہے اور وہ ہر مسرت سے کنارہ اختیار کر لیتا ہے اس کی قوت عمل شکست خوردہ ذہنیت کا شکار ہو جاتی ہے۔ اس وقت وہ زندگی سے فرار اختیار کرتا ہے۔ یہ فرار اپنی ہیئت بدل کر متعدد شکلوں میں نمودار ہوتا ہے مثلاً

۱۔ ریختی: ——— جس میں جسمانی لذتوں کا ذکر مزے لے لے کر کیا جاتا ہے اس کا مطمح نظر جنسیات سے آگے بڑھ ہی نہیں سکتا۔ شاعر اپنے غم کو یا ماحول کے غم کو ان لذتوں کی یاد میں فراموش کر دینا چاہتا ہے۔ وہ محبوب کے بو، رنگ اور لمس سے حظ اٹھاتا ہے مگر یہ شاعری کی ادنیٰ مثال ہے کبھی کبھی یہ فرار ہزل اور فحش گوئی کی طرف بھی مائل کرتا ہے۔

۲۔ ہجو: ——— اس میں وہ اپنے غم کا مداوا دوسروں کے مضحکہ اڑانے سے کرتا ہے۔ دوسروں کی خامیوں پر قہقہہ لگانا اور ان سے لطف اندوز ہونا۔ ان کے زخموں کو کرید کرید کر اپنی لذت کا اہتمام کرنا اور ان کی کمزوریوں سے بے جا فائدہ اٹھانا یہ سب زندگی سے فراری کے واسطے پناہ گاہیں تھیں اور اس میں کبھی ایسا ہوتا تھا کہ اگر دوسروں کے گریبان پر بس نہیں چلتا تو پھر اپنے گریبان پر تو اختیار ہے۔

۳۔ تصوف: ——— صحیح تصوف جو پختگی اعتقاد اور حسن عمل سے عبارت

نئے انداز سے برتے گئے ہیں۔ ضمیمہ دوم میں ایسی کتابوں اور رسائل کی فہرست دی گئی ہے جن سے راقم الحروف نے استفادہ کیا ہے، اسی کے ساتھ ان رسائل کی ایک فہرست بھی شامل ہے جو فانی کے مطالعہ میں مددگار ہو سکتے ہیں آخر میں غزلیات فانی کا انتخاب پیش کیا جا رہا ہے۔ اس انتخاب میں یہ خیال رکھا گیا ہے کہ اس سے فانی کی شاعری کے مختلف ادوار کے ساتھ ان کے رنگ کی ترجمانی بھی ہو سکے۔

آخر میں حضرت قبلہ و کعبہ پروفیسر ضیاء احمد صاحب کی خدمت میں ہدیۂ نیاز پیش کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے میری جسمانی اور ذہنی تربیت فرمائی جس کی بدولت میں اس مسودہ کو پیش کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔ برادر محترم پروفیسر ظفر احمد صدیقی صاحب (صدر شعبہ فلسفہ۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کا سپاس گزار ہوں جنھوں نے فانی کے فلسفیانہ مزاج کو سمجھانے میں مدد دی۔ میں اپنے دوست رشید حسن خاں صاحب کا بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے ہمیشہ اپنی عدیم الفرصتی کے باوجود مجھے مفید مشورے دیے۔ اس دور میں جبکہ طباعت و اشاعت کا مسئلہ مفت خواں سے کم نہیں محترم نسیم انہونوی صاحب نے اس کی اشاعت کی ذمہ داری لے کر میری مشکل کو آسان بنا دیا جس کے لیے تہ دل سے متشکر ہوں۔

ظہیر احمد صدیقی

شعبہ اردو۔ دہلی یونیورسٹی

۱۵ اگست ۱۹۶۸ء

ہے۔ اس سے یہاں بحث نہیں بلکہ تصوف کا وہ مفہوم مراد ہے جس نے ہر چیز کو تقدیر پرستی کا تابع بنا دیا۔ عمل اور ولولوں کو دبا کر زندگی کو جبر اور محکومیت کا لباس پہنا دیا۔ اس سے یہ ضرور ہوا کہ شاعر میں سنجیدگی پیدا ہو گئی مگر سعی و عمل کے جذبات سلب ہو گئے۔ وہ لا کی پر پیچ وادیوں میں اس طرح کھو گیا کہ الا کی طرف ذہن کی رسائی کی راہ مسدود ہو گئی۔

وہ لوگ جنھوں نے ریختی کو اپنی پناہ کا ذریعہ بنایا اور جسمانی لذتوں میں اپنے کو فراموش کر دیا، رنگین اور انشا ہیں۔ وہ لوگ جنھوں نے دوسروں کی کمزوریوں پر قہقہے لگائے اور ان کی تکلیف پر مسرت کا اظہار کیا سودا اور ضاحک ہیں وہ لوگ جنھوں نے تصوف کو اپنایا اور تقدیر پرستی پر قانع ہو گئے میر اور درد ہیں۔ مگر فانی کی ذات ان سب سے الگ ہے اس نے تصوف کو ضرور اپنانے کی کوشش کی مگر مسلک گوسفندی کو کبھی اختیار نہیں کیا اس کا غم ریختی اور ہجو دونوں کے سہارے سے بے نیاز ہے غم پرست عموماً تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اول تو وہ لوگ ہیں جن کا ذہن مستقل طور سے غم کی آماجگاہ نہیں۔ جب حالاتِ زمانہ کے زیر اثر ان لوگوں پر غم کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو ان کے افعال اور اعمال سے اضطراری کیفیت اور ربودگی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ اس دور سے گذر جاتے ہیں تو خوشی اور مسرت کا غلبہ بھی اسی طرح ہوتا ہے کہ خود فراموشی کی سی حالت طاری ہو جاتی ہے۔ اس قسم کے لوگوں میں انگریزی ادب میں شیلی کا نام قابل ذکر ہے۔ ایک وقت میں اس کو ہر شے پر مسرت اور شادمانی چھائی ہوئی نظر آتی ہے اور اس خوشی و کیف کے عالم میں یہ فراموش کر دیتا ہے کہ یہ مسرت عارضی بھی ہو سکتی ہے دوسرے لمحہ جب اس پر غم و الم کا غلبہ ہوتا ہے تو وہی ہر شے جو روشن تھی۔ تیرہ

نظر آتی ہے۔ اس وقت وہ بھول جاتا ہے کہ اس ناامیدی میں امید کی کرن بھی نمودار ہوسکتی ہے۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جو اپنی غم پرستی کے اظہار میں تفاخر سے کام لیتے ہیں۔ خوشی اور اس کے مظاہر پر حقارت کی نظر ڈالتے ہیں۔ ان لوگوں کی ذہنیت سطحی اور اوچھی ہوتی ہے اور ان کی پسند و ناپسند میں نظر کی گہرائی کے بجائے خود نمائی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ مسلک ان لوگوں کا ہے جو عنفوان شباب میں تشائم کی طرف رجحان رکھتے ہیں۔ ہمارے نئے ادیبوں اور شاعروں میں ایسی بے شمار مثالیں مل سکتی ہیں۔ تیسرے ان لوگوں کا نمبر آتا جو غم کو عین حقیقت قرار دیتے ہیں اور مسرت کے وجود کو معتبر نہیں سمجھتے اس مسلک کو اختیار کرنے کیلئے فلسفیانہ ژرف نگاہی کی ضرورت ہے۔ اردو میں جن لوگوں نے اسکو اختیار کرنے کی کوشش کی ان میں اکثر تصنع کا شکار ہوگئے! اسکے برخلاف فانی غم و مسرت دونوں کے وجود کا اقرار کرتا ہے مگر از روئے حقیقت شناسی اول الذکر کو آخر الذکر پر ترجیح دیتا ہے۔ اس کی وجہ خود فانی کی زبان سے سنیئے :۔

غم بھی گذشتنی ہے خوشی بھی گذشتنی — کر غم کو اختیار کہ گذرے تو غم نہ ہو

ایک جگہ غم کی دوسری توجیہ بیان کی ہے۔ ع

"غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں"

اس بیدردی کے لیے وہ غم کو اختیار کرتا ہے۔ وہ غم کو اس لیے ترجیح دیتا ہے کہ اس کے گذرنے کے بعد مسرت ہوگی مگر مسرت کے گذرنے کے بعد شاید وہ غم کا متحمل نہ ہوسکے۔ یہ فلسفہ فانی کی زندگی اور شاعری پر حاوی نظر آتا ہے وہ اس سے ایک انچ ہٹنے کے واسطے تیار نہیں۔ جب وہ 'غم دوراں کو غم جاناں بنانا جانتا ہے[1] تو پھر اس سے فرار کیا معنی! اس لیے وہ بڑھتا ہے

---

[1] آلام روزگار کو آساں بنا دیا — جو غم ہوا اسے غم جاناں بنا دیا

اور غم کو گلے سے لگا لیتا ہے۔

فانی کے غم کے متعلق لوگ مختلف الخیال نظر آتے ہیں۔ کسی کا کہنا ہے کہ دہ شاید ازل ہی کے یہاں سے دردمند دل لے کر آیا تھا۔ کسی کا دعوا ہے کہ عشق کی ناکامیوں نے اس کی نوا کو نوحہ بنا دیا۔ کسی نے ماحول کی ناسازگاری کو غم کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ بعض نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ غم و رنج میں دوسروں کے گریبان پر بس نہ چلا تو اپنے ہی گلے کو گھونٹنے کا دلولہ پیدا ہو گیا۔

اگر ہم حیات انسانی کا تجزیہ کریں تو اس میں دو عنصر کارفرما نظر آئیں گے غم اور مسرت۔ یہ دونوں ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح پیوست ہیں جیسے ایک ورق کے دو صفحے۔ ایک وقت محفل میں ماتم و شیون ہو رہا ہے دوسرے وقت ہنسی قہقہے کی گونج سنائی دیتی ہے۔ غم و مسرت انسان کے سب سے ابتدائی جذبات ہیں۔ سوال صرف اس قدر پیدا ہوتا ہے کہ ان دونوں میں مقدم کس کو سمجھا جائے۔ فطرت انسانی کے بڑے بڑے محققین اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ رنج والم انسانی زندگی کی ایک فطری حقیقت ہے جس سے گریز ممکن نہیں۔ اگر اس کی فلسفیانہ توجیہ کی جائے تو یہ امر واضح ہو جائے گا کہ زندگی حرکت اور تڑپ کا نام ہے۔ برگساں اس کا قائل ہے کہ "کائنات ساکن نہیں بلکہ متحرک ہے" حرکت صرف تاریکی سے روشنی میں آنے کا نام نہیں ہے بلکہ روشنی سے تاریکی میں بھی جانے کو حرکت کہتے ہیں۔ جب یہ حرکت رک جاتی ہے تو فنا کا وجود ہوتا ہے۔ فانی کہتا ہے۔

راحت کا مفہوم یہی ہو جہد طلب سے باز نہ آ　　بڑھنے دے دل کی بیچینی، تڑپے جا آرام نہ لے

غم کے ٹہوکے کچھ ہوں بلا سے آکے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

خود برق ہو اور طور تجلا سے گذر جا خود شعلہ بن اور وادیٔ سینا سے گذر جا

مرے جوشِ طلب کی شان استغنا کوئی دیکھے
کہ میں رہبر سے آگے، مجھ سے آگے ہے قدم میرا

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا

اے دردِ یہ چٹکیاں کہاں تک اٹھ اور جگر کے پار ہو جا

فانی کے یہاں غم کس پہلو سے آیا، غم نے آخر وہ کون سا راستہ اختیار کیا جو اس کو فانی تک بارملا؟ یہ سوال دلچسپ ہونے کے ساتھ پیچیدہ بھی ہے۔ غم ایک تو وہ ہے جو فلسفہ کی راہ سے آتا ہے جیسے شوپنہاور کے یہاں ہے ایک وہ غم ہے جس کے ذریعہ سے انسان فلسفیانہ تفکر تک پہونچتا ہے اس کی مثال ہارڈی وغیرہ ہیں۔ فانی کا غم دراصل اس کی آپ بیتی ہے جس کو وہ فلسفیانہ رنگ دیتا ہے۔ غم پر آنسو بہانا ایک فطری امر ہے۔ جب فانی کو غم سے واسطہ پڑا تو ان کے وہ اوصاف جن پر تقلید کا زنگ چھایا ہوا تھا ایک ساتھ جلا پا گئے۔ قاضی عبدالغفار نے ایک جگہ فانی کی زبان سے غم کی شرح اس طور سے کی ہے:۔

"زندگی شعر ہے۔ مگر زندگی کا ہر جذبہ اور ہر بحران شعر نہیں۔ صرف غم شعر ہے۔ تازہ پھول کا حسن شعر کا ایک ادنیٰ مقام ہے مگر مرجھائے ہوئے پھول کی گذری ہوئی رعنائی مٹا ہوا رنگ حقیقی شعریت کا ارفع ترین مقام ہے۔ اس نے کہا۔ تہقہوں میں شعر اگر ہے تو بہت کم۔ البتہ اس کی ساری دنیا آنسو میں ہے۔ ایک زخم میں ہے اور وہ زخم جس قدر زیادہ ناقابل علاج ہو شعر اتنا ہی زیادہ بلند اور بلیغ ہو جاتا ہے۔"[1]

---

[1] کلیات فانی مقدمہ

فانیؔ کو اہلِ غم سمجھنے کا ایک سبب یہ ہے کہ ان کے یہاں امید اور خوشی کی کرن یا تو آتی نہیں یا اگر آتی ہے تو چند لمحوں کے واسطے جن کے بعد پھر یاس و حرماں کی تاریکی شروع ہو جاتی ہے۔ اس کو جب خوشی کے لمحات آکر گدگدانے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو بھی پکار اٹھتا ہے۔

کیا جامِ مئے ہوش رُبا دیتا ہے — کیا مژدۂ ردِ ہر بلا دیتا ہے
ہر قطرۂ مئے ہے خونِ صد عیش بدوش — مے دے کے فریبِ عیش کیا دیتا ہے

وہ جانتا ہے کہ اس کو جو کچھ دیا جارہا ہے وہ حقیقت میں "عیش" نہیں بلکہ "فریبِ عیش" ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ غم ہی کو حاصلِ نشاط خیال کرتا ہے۔ ایک رباعی سنیے:۔

غم عینِ نشاط و رازِ تخلیقِ نشاط — غم حجتِ انبساط و تصدیقِ نشاط
غم کا ہے تبسم جسے کہتے ہیں وجود — ہستی کو ہے غم کے دم سے توفیقِ نشاط

وہ جب کلیوں کو متبسم دیکھتا ہے تو متنبہ کرتا ہے۔

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حال انھیں معلوم نہیں
کلیوں کا یہ طرزِ تبسم یہ شادابی کیسا ہے (۱)

یہی غم جب آگے بڑھتا ہے تو یاس کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ جن کو اپنی بدنصیبی کا کامل یقین ہے۔ وہ زندگی اور موت میں کوئی تفریق نہیں کرتے۔

فانیؔ کی زندگی بھی کیا زندگی تھی یارب — موت اور زندگی میں کچھ فرق چاہیئے تھا

یاس و ناامیدی کی سینکڑوں مثالیں فانیؔ کے یہاں مل جائیں گی۔ چند ملاحظہ ہوں:۔

---

(۱) میرؔ کا شعر ہے

جو پوچھا کہ کتنا ہے گل کا ثبات — کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

محشرؔ بدایونی:۔

ہمدردیٔ گل پر ہنسی جب کوئی کلی — آواز دی خزاں نے کہ تو بھی نظر میں ہے

شوق سے ناکامی کی بدولت، کوچۂ دل ہی چھوٹ گیا
ساری امیدیں ٹوٹ گئیں، دل بیٹھ گیا، جی چھوٹ گیا

برق کو اب کیا غرض، کیا رہ گیا کیا جل گیا — جل گیا خرمن میں جو کچھ تھا مری تقدیر کا
بہت سر پیٹتی ہیں آرزوئیں — کوئی ناکام جاتا ہے جہاں سے
پھولوں سے تعلق تو اب بھی ہے مگر اتنا — جب ذکر بہار آیا، سمجھے کہ بہار آئی
یاس نے درد ہی نہیں حق تو یہ ہو دوا بھی دی — فانی نا امید کو موت کا آسرا دیا

ایک جگہ ایذا پسندی کی حد کر دی ہے۔

بچھ گئے راہ یار میں کانٹے — کس کو عذر برہنہ پائی ہے[1]

فانی کے دردمند دل کی مثال اردو شاعری میں میر کے علاوہ کسی دوسرے شاعر میں مشکل سے ملے گی۔ میر کا غم شخصی اور سادہ ہے جو محبت کی ناکامیوں اور زندگی کی تلخیوں کے باعث فطرت انسانی سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ میر کا غیر معمولی احساس اس میں شدت پیدا کرتا ہے۔ انکے لہجے کی نرمی اور گھلاوٹ، انکے غم کو تہذیب نفس بخشتی ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ میر کے یہاں فلسفیانہ رجحان اور آفاقیت اسی لیے پیدا ہوئی کہ ان کے یہاں غم ہے۔ فانی کے غم میں بھی خلوص ہے وہ ان کا ذاتی اور حقیقی غم ہے۔ لیکن اس پر ایک عام انسان کی طرح

[1] اس خیال کو دوسرے شعرا نے بھی ادا کیا ہے۔

غالب:- ان آبلوں سے پاؤں کے گھبرا نہ جائے دل — جی خوش ہوا ہے راہ کو پر خار دیکھ کر
اقبال:- ہیں عقدہ کشا یہ خار صحرا — کم کر گلۂ برہنہ پائی
ظفر بدایونی:- مجھے تو چارہ گر فرصت کش آزار رہنے دے — نکالیں خار تلوؤں کے تو نوک خار رہنے دے
تہور بدایونی:-
یہ افسوس خلش اے چارہ گر تلوؤں کے چھالے میں — کہ پھر دل پھوٹ کر رو دیے ہیں جب کانٹے نکالے ہیں

اہل سخن سے یہ نکتہ پوشیدہ نہیں کہ فانی نے ایذا پسندی کو فلسفیانہ انداز میں پیش کرنے کے باوجود اکی شعریت کو برقرار رکھا ہے

تڑپنے اور نالہ کرنے کی بجائے وہ اس کو اپنے فلسفیانہ فکر کا موضوع بناتے ہیں۔ وہ اس کو زندگی کی ناگزیر حقیقت بلکہ "ہر کہ از دوست می رسد نکواست" خیال کرکے گلے سے لگا لیتے ہیں۔ ان کی ناکامیوں نے ان کے غم کو بنا سنوار کر ایک نئے روپ میں پیش کیا جہاں غم میں شدت تو ہے مگر تلخی نہیں ہے۔ "جہاں غم کو انھوں نے نئے آداب سے سنوارا۔ نئے تکلفات سے نکھارا"[1] اگر ان کا غم عارضی یا سطحی ہوتا تو چند روز کے بعد ہمیشہ کے واسطے بجھ جاتا مگر "جب غم زندگی بن جائے۔ جب زندگی جاوید کی خواہش کبھی عزیز نہ رہے۔ اس وقت موت سے زیادہ خوبصورت کوئی چیز نہیں۔ اس کی تاریکی روشنی پیدا کر سکتی ہے"[2]۔ ان کی اس آواز میں بلند آہنگی ہے مگر یہ بلند آہنگی کانوں کو ناگوار نہیں گذرتی بلکہ خوش آہنگی کے سبب اس میں سرور پیدا ہو جاتا ہے اس کی مثال ایسے درد بھرے نغمے کی سی ہے جو کسی تاریک سناٹے میں ساز پر گایا جا رہا ہے۔ جو سنتا ہے وہ اس کو اپنے ہی دکھ بھرے دل کی صدا خیال کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ فانی کا غم مریضانہ نہیں ہے۔ ان کی شاعری "کافور"، "تربت"، "لحد" اور "کفن" کی شاعری نہیں ہے بلکہ اس میں غم کا عرفان موجود ہے۔ یہ عرفان غم کی ہیئت بدل دیتا ہے۔ وہی مکروہ اور بھیانک موت جو مہیب معلوم ہوتی تھی فانی کے یہاں حسین ہو گئی۔

ادا سے آڑ میں خنجر کے منہ چھپائے ہوئے　　وہ لائے میری قضا کو دلہن بنائے ہوئے

موت کا عنوان فانی کے یہاں کثرت سے ملے گا۔ موت کے عنوان پر متعدد شعراء نے اظہار خیال کیا ہے مگر باستثنائے چند مفکرانہ انداز نظر سب کے یہاں مفقود ہے۔ اس کا ذکر سطحی اور رسمی طور پر مل جائے گا۔ مگر فانی کی حیثیت اس سلسلہ میں انفرادی

---

[1] فانی بدایونی۔ فراق۔ علی گڑھ میگزین فانی نمبر

[2] " " احتشام حسین "

ہے۔ انھوں نے موت کے مسئلہ پر عارفانہ نظر ڈالی ہے۔

دریوزۂ فنا مرے مسلک میں ہے حرام
فانی سکون موت نے دل سے مٹا دیا

دَر پردہ زندگی کا تقاضا کہیں جسے
وہ نقش بے قرار کہ دنیا کہیں جسے

موت ہی ساتھ دے تو دے فانی
عمر کو عذرِ بے وفائی ہے

زندگی خود کیا ہے فانی یہ تو کیا کہیئے مگر
موت کہتے ہیں جسے وہ زندگی کا ہوش ہے

ایسے اشعار کو مرگھٹ یا جنازے کی شاعری کہنا تنقید نہیں ہے۔ تنقید کے ساتھ ظلم ہے۔ بقول فراق :۔

"ہم کیوں بھول جائیں کہ تاریخ انسانیت بیمار پڑ پڑ کر اپنے کو صحتیاب نمائی ہے۔ شاعر کی زندگی بسا اوقات انسانی تاریخ کے ان بحرانی دنوں کی نشانی اور علامت ہوتی ہے جو بیک وقت زندگی اور موت کے امکانات کے حامل ہوتے ہیں[1]"

ان کے یہاں پناہ گزینی کا جذبہ نہیں ہے بلکہ وہ زہر کو زہر سمجھ کر پیتے ہیں۔ وہ اس کے بھی روادار نہیں کہ زہر میں دوا بھی ملائی جائے ۔ ع

بس اب تو زہر ہی دے، زہر میں دوا نہ ملا"

بقول سرور صاحب "فانی کے یہاں غم کا عرفان ملتا ہے جو غم اور موت دونوں کو گوارا بنا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ موت سے گریزاں نہیں ہوتے بلکہ خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں[2]۔ وہ پناہ کی خاطر غم کو اختیار نہیں کرتے۔ یہ ضرور ہے کہ ان کے یہاں کوئی جدوجہد کا پیغام نہیں ہے مگر پھر بھی ان کا غم جامد اور مضمحل نہیں بلکہ اس میں ایک تڑپ ہے۔ اس اعتبار سے وہ اقبال سے نزدیک ہیں۔

---

[1] فانی از فراق گورکھپوری
[2] فانی بدایونی آل احمد سرور۔ تنقیدی اشارے۔

راحت کا مفہوم یہی ہے جہد طلب سے باز نہ آ
بڑھنے دے دل کی بے چینی تڑپے جا، آرام نہ لے

دل تو دل ہے۔ دل کو چین آجانا تو آسان نہیں
درد وہ ہے جو دل میں اٹھ کر آپ بھی پھر آرام نہ لے

فانی کا یقین ہے:۔

"شاعر جس ماحول میں پیدا ہوتا ہے (وہ کسی ملک کسی قوم یا کسی زمانہ کا شاعر ہو) وہ اس کا ماحول نہیں ہوا کرتا۔ جس دنیا میں اس کا ظہور ہوتا ہے وہ دنیا اس کی اپنی دنیا سے بہت پیچھے کی دنیا ہوا کرتی ہے وہ زمانہ مستقبل کا انسان ہوا کرتا ہے"[1]

اقبال مرد مومن کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔

نشان مرد مومن با تو گویم چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

اس کی بدلی ہوئی شکل فانی کے یہاں ملتی ہے۔

ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا مردانہ وار جی اور مردانہ وار مرجا

یہ غم ہی کا فیضان ہے کہ اس نے اقبال کو خودی بخشی اور فانی کو بے خودی۔ مگر بے خودی کے باوجود فانی کے یہاں احساس خودی بھی موجود ہے۔ مگر یہ احساس خودی فانی کی انفرادی تجربات اور ذاتی واردات کا رہین منت ہے۔ اقبال کی طرح کسی اجتماعی اور ملی پیغام کا حامل نہیں۔ اس لیے کہ فانی شاعری کو اصلاح تبلیغ کے ذریعہ کے طور پر استعمال کرنے کے قائل نہیں۔

تسلیم ہیں مجھے بھی تری بے نیازیاں یہ کیا کہوں کہ میری تمنا غیور ہے
میں ہوں فانی صحیفہ باقی حرف بے معنیٔ فنا کی قسم

---

[1] سب رس (حیدرآباد) جنوری ۱۹۴۱ء۔ فانی کی ریڈیائی تقریر۔

دنیا مری بلا جانے مہنگی ہے یا سستی ہے — موت ملے تو مفت نہ لوں ہستی کی کیا ہستی ہو

نازم بہ تکیہ کردن فانی بہ لطف دوست — اے داغ غرور مردن و مغرور زیستن

مرے شوق نے سکھایا اسے شیوہ تغافل — نہ مجھے نیاز ہوتا، نہ وہ بے نیاز ہوتا

کبھی وہ عصمت کامل کے دعووں کو اپنے عجز گناہ کا حاصل خیال کرتے ہیں۔

عجز گناہ کے دم تک ہیں عصمت کامل کے جلوے
پستی ہے تو بلندی ہے، راز بلندی پستی ہے

رنج و آرام کی شدت اور امید کے راستوں کا مسدود ہو جانا، شاعر کی اذیت اور پریشانی کے لیے بہت ہے۔ اگر مسلسل ناکامیوں اور پیہم مایوسیوں سے گھبرا کر وہ فریاد کرتا ہے تو یہ فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ چنانچہ خود ایک جگہ لکھتے ہیں:۔

"جب کوئی حقیقی شاعر دنیا کے سامنے آیا۔ دنیا نے اسے کبھی نہیں پہچانا اس کی زندگی میں اس کے ساتھ دو طرح کا سلوک ہوا۔ بعض نے اسے آدمی تو سمجھا مگر ذلیل و حقیر۔ اس لیے کہ اس کا وجود دنیاوی اعتبار سے افادی نقطۂ نظر سے بے کار تھا۔ بعض جنھوں نے اس کی بلندی تخیل اور پرواز خیال کی اپنے نزدیک بہت کچھ قدر فرمائی اسے آدمی سے بالاتر سمجھا۔ اسے کوئی فرشتہ یا کوئی مجسمہ روح تصور فرمایا۔ ان کے نزدیک چونکہ اس کی زندگی صرف روحانی زندگی تھی اس لیے وہ یہ نہ سمجھ سکے کہ اس کو بھی اپنی زندگی انسانوں کی طرح بسر کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کو اس کا یقین ہی نہ آیا کہ وہ کھانے پینے، سونے جاگنے اور سردی سے محفوظ رہنے کے سامان سے بے نیاز نہیں ہے۔ ان کے پاس یہ باور کرنے کی کبھی کوئی معقول وجہ نہ تھی کہ شاعر بھی دنیاوی تکالیف سے متاثر ہو سکتا ہے۔[1]"

[1] سب رس - حیدرآباد (شعر و شاعری)

دیباچۂ ثانی

فانی کی شاعری کا پہلا اڈیشن ۱۹۶۹ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہونے جا رہا ہے۔ اس دوران میں کتنے طوفان آئے اور گذر گئے۔ یہ طوفان سیاسی بھی تھے اور سماجی بھی۔ اس میں ذاتی بھی تھے اور غیر ذاتی بھی۔ ان سب کا اثر میرے ذہن پر نقوش مرتب کرتا رہا۔ مگر ان ذہنی انقلابات میں میرا اور فانی کا ساتھ نہیں چھوٹا زمانہ کی تبدیلیوں کے ساتھ فانی سے عقیدت میں اضافہ ہوتا رہا۔

اپنی اس کتاب کو اشاعت ثانی کے لیے اضافہ اور تبدیلیوں کے بعد پیش کر رہا ہوں۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب فانی شناسی میں معاون ہوگی۔

جب اس کتاب کو پیش کر رہا ہوں تو ایک احساس شدید ہے کہ جب میں کچھ لکھتا تھا تو حضرت قبلہ وکعبہ مولانا ضیاء احمد صاحب مرحوم و مغفور بدایونی کی خدمت میں اصلاح کے لیے پیش کر دیتا ہے۔ اس کے بعد اعتماد پیدا ہو جاتا تھا کہ اب اس موضوع پر پورے ایمان و ایقان کے ساتھ بات کر سکتا ہوں۔ آج وہ ہمارے درمیان نہیں ہیں تو سچ پوچھیے کہ لکھنے کے لیے بھی جی نہیں چاہتا میں نے ہی نہیں بلکہ معلوم نہیں کہ کس کس نے اس خلا کو محسوس کیا ہوگا

لوگ کچھ پوچھنے کو آئے ہیں　　اہل میت جنازہ ٹھہرائیں

اس غم کے ساتھ ایک غم کا اور بھی اضافہ ہو گیا کہ میرے محترم استاد

اف کہ گنہگار ہم ہیں تو مگر خطا معاف — آٹھ پہر کے درد نے دل ہی تو ہے دکھا دیا
جتنے غم چاہے دے جا مجھے یا رب لیکن — ہر نئے غم کے لیے تازہ جگر پیدا کر

جیسا کہ کہا گیا کہ اس قسم کے لمحات کہ جس میں فانی نے غموں سے گھبرا کر شکوہ کیا ہو بہت کم ہیں۔ فطرت انسانی کے تقاضے سے اگر آہ نکل گئی ہو تو دوسری بات ہے ورنہ عام طور پر انھوں نے غم سے مفاہمت سی کر لی ہے۔ وہ غموں سے گھبرانے کی بجائے اس کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ان کو اس کا صدمہ نہیں کہ غم کیوں عطا کیا بلکہ یہ خیال ہے کہ غم جاوداں کیوں نہیں بخشا۔

وہ بدگماں کہ مجھے تاب رنج زیست نہیں — مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا

کبھی وہ "قسمت کے حرف" مٹانے کے آرزومند ہوتے ہیں مگر "تقدیر" پانسہ پلٹ دیتی ہے۔ ایک مایوس انسان جس کو ہر طرف تاریکی نظر آئے جو دنیا کے ہر سہارے کو کمزور خیال کرے۔ وہ عام طور سے ہر سہارے کا دامن چھوڑ دیتا اور ہر ایک سے رشتہ توڑ دیتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ حقیقی سہارے سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ مگر ان تمام مایوسیوں کے باوجود فانی "لاتقنطو" کا دامن نہیں چھوڑتے در حقیقت میں یہی سبب ہے جو ان کا غم گراں بار اور بوجھل نظر نہیں آتا اور یہی باعث ہے کہ وہ غم کے خواہش مند ہونے کے باوجود غم پرست نہیں بنتے۔ ان کے یہاں غم کا عرفان ملتا ہے جو ان کی شاعری میں بدرجہ اتم ہے مگر وہ یاس پسند کبھی نہیں ہوئے۔ دراصل ان کے غم کے سیلاب کو "ایقان" اور "ایمان" ہلکا کر دیتے ہیں۔ چند اشعار سنیئے اور بتائیے کہ ایک یاس پسند کے یہی تیور ہوا کرتے ہیں۔

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ — اک تو ہی ناخدا نہیں ظالم خدا بھی ہے
یا رب تری رحمت سے مایوس نہیں فانی — لیکن تری رحمت کی تاخیر کو کیا کہیے
صبر شایان محبت تو نہیں ہے لیکن — شکر گر بن نہ پڑے شکوہ بے داد نہ کر

وہ موت کی تمنا بھی کرتے ہیں تو اس خیال سے رک جاتے ہیں کہ ہماری موت اور زیست کا انحصار خدا کی مرضی پر ہے۔

کیا کروں نازک بہت ہے ان کی مرضی کا سوال
ورنہ فانی اس جیسے جانے سے کچھ حاصل نہیں

مختصر یہ کہ فانی کے غم کی صحیح نوعیت سمجھنے کے لیے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ ان کا غم وجودی (EXISTENTIAL) غم ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ زندگی اور اس کے مسائل کے متعلق فانی وجودی نظریہ کے حامل ہیں۔ لیکن احساس غم اور استقبال غم میں وہ بہت کچھ وجودی فلسفیوں کے مماثل نظر آتے ہیں۔ وجودی فلسفہ کو غم سے خاص تعلق ہے۔ تقریباً ہر وجودی مفکر کے یہاں غم کا شدید احساس اور اعتراف نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مفکر زندگی معتبر اور جیئے جانے میں امتیاز کرتے ہیں۔ جہاں تک جیئے جانے یا محض حیوانی حیات کا تعلق ہے۔ حیوانات اور جدید سائنسی تحقیق کے مطابق نباتات بھی ذی حیات کہے جانے کے مستحق ہیں۔ لیکن زندگی یا زندگی معتبر کا مصداق صرف انسان ہی ہو سکتا ہے۔ فانی اپنے اس شعر میں وجودی عقیدے کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

ہر زندگی کا نام نہ رکھ دل کی زندگی ایمان زندگی پہ نہ لا آزما کے دیکھ

غرض وجودی فلسفی زندگی کو ایک طے شدہ حقیقت کی طرح قبول کرنے کے بجائے ایک اہم تجربہ کی حیثیت سے اس کو دیکھتا ہے۔ وہ زندگی کی خود بینی و خود نگری کا قائل ہے۔ یہ سنجیدہ نظرانہ خود نگری اس کو زندگی کے غم و الم سے آشنا کرتی ہے۔ ڈنمارک کے اور وجودی فلسفہ کے بانی کیر کے گارڈ (KIERKEGAARD)

کے یہاں غم کی لہر اس کے شدید احساس اور غیر معمولی تجربات زندگی سے پیدا ہوتی ہے۔ فرانس کا وجودی فلسفی سارتھر (SARTRE) اختیار اور ذمہ داری کے بوجھ سے دب کر اور اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہونے کے لیے اپنے ملحدانہ فلسفہ میں کوئی روشنی نہ پاکر درد و کرب سے چیخ اٹھتا ہے۔ اسی طرح مارشل (MARSHALL) اور یاسپر (TASPER) تصور مرگ یا تمناؤں کی شکست سے درس غم لیتے ہیں۔ بعض کے یہاں زندگی معتبر یا وجود برائے خود سے محروم ہو کر وجود محض میں تبدیل ہو جانے کا خوف، احساس غم والم کا باعث بنتا ہے غرض ان تمام فلسفیوں کے یہاں ایک چیز مشترک ہے۔ ان کا غم ایک طرف تو ذاتی اور شخصی غم ہے اور دوسری طرف ان کے فلسفیانہ نقطۂ نظر اور موشگافیوں کا رہین منت ہے۔ فانی کے غم کے متعلق بھی ہم یہی بات دہرا سکتے ہیں کہ ان کا غم شخصی اور انفرادی ہوتے ہوئے بھی ان کی فلسفیانہ نظر سے گہرائی اور گیرائی حاصل کرتا ہے۔ ان کی صوفیانہ روش اس کو عظمت اور تقدیس بخشی ہے۔ اس لحاظ سے اگر ان کی شاعری کو کتاب غم کی تفسیر کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا اور یہ کہنا بھی مبالغہ نہ ہوگا کہ فلسفہ غم کی تشریح اور تفسیر کرنے والوں میں فانی کی ذات سب سے ممتاز اور منفرد نظر آتی ہے۔

عشق یا محبت ایک عالمگیر جذبہ ہے جو متمدن اقوام اور وحشی سے وحشی قبائل کے یہاں مشترک نظر آئے گا۔ جذبے کے لطافت یا کثافت سے یہاں بحث نہیں۔ مگر کسی نہ کسی شکل میں وہ سب کے یہاں موجود ہے۔ انسان تو اشرف المخلوقات ہے۔ محبت سے حیوانات بلکہ نباتات و جمادات بھی محروم نہیں۔ رومی نے کہا تھا۔

عشق جو شد بحر را مانند دیگ   عشق ساید کوہ را مانند ریگ

یہاں اس کی ضرورت نہیں کہ عشق کے بارے میں صوفیہ۔ اطبا، عقلا۔ شعرا۔ کے مختلف نقطہ ہائے نظر سامنے لائے جائیں۔ ہمیں یہاں صرف یہ دیکھنا ہے کہ فانی نے عشق کو کیا سمجھا اور اس کا کیا تصور پیش کیا ہے۔ مجنوں صاحب نے فانی کی یاسیت کے سلسلہ میں ایک دلچسپ فیصلہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

"فانی کیا دنیا کا کوئی فن کار یا شاعر قنوطی نہیں ہوتا۔ انگریزی شاعری میں تصوف پر نظر ڈالتے ہوئے ایک نقاد خاتون نے لکھا ہے کہ صوفی یا عارف کبھی قنوطی نہیں ہو سکتا اور جے بی پرسٹلے اے ای ہاؤسمین کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتا ہے کہ کوئی شاعر صحیح معنی میں قنوطی نہیں ہوتا۔ ہر شاعر صاحب تخییل ہوتا ہے اور کم سے کم اپنے تخییل پر جاہے؛ وہ ہمارے خیال میں کتنا ہی سقیم کیوں نہ ہو وہ ایمان رکھتا ہے اور اس کو خیر و برکت کا سرچشمہ خیال کرتا ہے۔ اگر یہ کلیہ صحیح ہے اور کوئی وجہ نہیں کہ اس کو صحیح نہ مانا جائے تو فانی بھی قنوطی شاعر نہیں تھے۔ وہ بھی ایک تخییل رکھتے تھے جس کو وہ سینہ سے لگائے ہوئے تھے۔ اس تخییل کو وہ زندگی کی ساری کلفتوں اور اذیتوں کا کفارہ سمجھتے تھے۔ اس تخییل کا نام ان کی لغت میں موت ہے جو عشق کی آخری معراج ہے۔[1]"

اقتباس طویل ہو گیا مگر اس کے بغیر بات مکمل نہیں ہوتی۔

فانی کی شاعری صرف فکری ہی نہیں جذباتی بھی ہے اور انھوں نے جہاں عشق

---

[1] غزل سرا۔ مجنوں گورکھپوری

یا معشوق کا ذکر کیا ہے وہاں ٹھہرے اور سلجھے ہوئے بلکہ پاکیزہ اور بلند جذبات کی ترجمانی کی ہے اگرچہ وہ باقاعدہ صاحب حال و قال نہیں نہ ان کو کسی خانوادۂ تصوف سے بیعت و ارادت کا تعلق حاصل ہے۔ وہ جس ماحول میں پلے بڑھے تھے وہاں تصوف کا زیادہ چرچا بھی نہ تھا۔ ان کے والد عقیدتاً اہل حدیث تھے اس لیے بیعت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ فانی کو ذاتی طور پر تصوف سے رجحان لگاؤ تھا۔ ان کے جذبات واقعی اور ان کا عشق صادق تھا۔ ان کا عشق برائے گفتنی یا روائتی نہیں۔ وہ جو کچھ کہتے ہیں ڈوب کر اور محسوس کر کے کہتے ہیں۔ اور جو ترانہ نکلتا ہے ان کے دل کی گہرائیوں سے نکلتا ہے۔

ہزار ڈھونڈھیے اس کا نشاں نہیں ملتا
جبیں ملے تو ملے، آستاں نہیں ملتا

تری تلاش کا فانی الجملہ ماحصل یہ ہے
کہ تو یہاں نہیں ملتا وہاں نہیں ملتا

مجھے بلا کے یہاں آپ چھپ گیا کوئی
وہ مہماں ہوں جسے میزباں نہیں ملتا

وہ جلوہ مفت نظر تھا نظر کو کیا کیئے
کہ پھر بھی ذوق تماشا نہ کامیاب ہوا

تری تلاش کا افسانہ گر جہاں ہوتا
وہ مجاز کا ہر ذرہ اک زباں ہوتا

وہ جب خیال کرتے ہیں کہ ان کی ہستی محبوب سے الگ کوئی وجود نہیں رکھتی تو ان کو یک گونہ کیف حاصل ہوتا ہے اور وہ کہہ اٹھتے ہیں۔

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا
اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

وہ تو میرے سامنے تھے دیکھنے کی دیر تھی
میں نے آنکھیں بند کر لیں ورنہ پردہ کچھ نہ تھا

حسن ہے ذات مری، عشق صفت ہے میری
ہوں تو میں شمع مگر بھیس ہے پروانے کا

عشق ہے پرتو حسن محبوب
آپ اپنی ہی تمنا کیا خوب

انھوں نے وحدت الوجود کو ہمیشہ اپنے لیے اکسیر بھی سمجھا ہے اور ہر

مرض کی دوا بھی۔ اس نے ان کی روحانی تعمیر میں حصہ لیا ہے اور ذہنی سکون کے کام بھی آیا ہے۔ جب وہ دنیا کے انکار سے آزردہ۔ اہل دنیا کے برتاؤ سے افسردہ اور امواج حوادث کے تلاطم سے مضطرب ہوتے ہیں تو یہی اعتقاد ان کی آخری تسکین کا وسیلہ بنتا ہے۔ فانی کے نظریۂ تصوف پر تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ اس لیے اس کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ البتہ یہاں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ ان کے یہاں عشق کا تصور عام طور سے عشق حقیقی کے معنی میں آیا ہے اور وحدت الوجود کا عقیدہ ان پر اس قدر حاوی ہے کہ عشق مجاز کا رنگ اس کے سامنے پھیکا پڑ گیا ہے۔ اگر اس پر بحث کی جائے تو خاصی کتاب تیار ہو سکتی ہے ہم یہاں صرف چند مثالوں پر اکتفا کریں گے۔

کثرت تکرار حسن وحدت کا نام ہے۔

کثرت میں دیکھتا جا تکرار حسن وحدت — مجبور یک نظر آ، مختار صد نظر جا

وحدت حسن کے جلوؤں کی یہ کثرت اے عشق — دل کے ہر ذرے میں عالم ہے پری خانے کا

بے واسطہ خود نگری اپنی طرف دیکھ — آئینہ اٹھا۔ حسن خود آرا سے گذر جا

غم کا یہ اعزاز کم نہیں کہ دوست کی مرضی کا دوسرا نام ہے۔

زندگی یاد دوست ہے یعنی — زندگی ہے تو غم میں گزرے گی

زہے تقدیر ناکامی کہ تیری مصلحت ٹھہری — تری مرضی سے وابستہ ہوا اللہ رے غم میرا

ناظر کی ہستی منظور سے الگ نہیں۔ اس لیے نظارہ محال ہے۔

اٹھتی نہیں ہے تہمت نظارۂ جمال — منھ دیکھتا ہوں جلوہ نظارہ ساز کا

لیکن اوپر کے بیان سے ہرگز یہ قیاس نہ کرنا چاہیئے کہ ان کی حیثیت صرف ایک صوفی شاعر کی ہے وہ دراصل غزل کے شاعر ہیں۔ اور ان کی غزل تمام سرمایۂ شعر

اردو میں ایک انفرادی اور بلند رتبہ رکھتی ہے۔ اور یہ بات (خواہ غزل کے معائب میں داخل ہو یا محاسن میں) ایک امر مسلم ہے کہ وہ بڑی حد تک عشق مجاز کی ترجمان ہوتی ہے، غزل ہمارے ماحول، ہمارے کلچر، اور ہمارے داخلی مزاج کی خاص پیداوار ہے خود عشق و محبت، حسن و شباب اور وصل و ہجر کے نغمے جن کا صنف غزل سے خاص اور گہرا تعلق ہے جب غزل میں جگہ پاتے ہیں تو ایک تہذیبی قوت کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ جہاں محبت میں مجاز کا رنگ نمایاں ہوتا ہے وہاں اکثر مذاق سلیم مکدر ہونے کے بجائے محظوظ ہوتا ہے۔ آیئے اس نقطہ نظر سے فانی کے کلام پر نظر ڈالیں اور دیکھیں کہ ان کے عشق مجاز کا تصور کیا تھا۔

محبوب کی ادائے خود فراموشی۔

ان کو شباب کا نہ مجھے دل کا ہوش تھا　　اک جوش تھا کہ محو تماشائے جوش تھا

معشوق کی کارفرمائی:۔

اک کفر سراپا نے کیا حشر کا قائل　　میں معتقد حشر مجسم نہ ہوا تھا

محبوب کی آمد سے گھر کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے۔ دیکھئے اس کو کس طرح بلاتے ہیں

تم نے دیکھا ہے کبھی گھر کو بدلتے ہوئے رنگ　　آؤ دیکھو نہ تماشا مرے غم خانے کا

عاشق کی تباہی مسلم ہے اور ان کی قسمت میں خوش بختی کا وجود نہیں ہے۔

وعدے کی رات گردش افلاک رک گئی　　جب تم سے بن گئی تو زمانہ بگڑ گیا

ہر شاخ ہر شجر سے نہ تھی بجلیوں کو لاگ　　ہر شاخ ہر شجر پہ مرا آشیانہ تھا

غزل کی خصوصیات میں جمالیاتی حسن اور تخیل کی کارفرمائی بھی شامل ہے اس کی بنیاد ہی تخیل اور جذبہ کے امتزاج پر ہے۔ جمالیاتی حسن کی کوئی ایسی تعریف ممکن نہیں ہے جو مکمل ہو اور کوئی ایسا سانچہ نہیں ہے جس پر جمالیاتی احساس کو

ڈھالا جاسکے اس کے لیے وجدان کا سہارا لینا ہوگا۔ غزل اور خصوصاً داخلی غزل کی سب سے بڑی ضرورت ہے جس کو جمالیاتی حسن کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس طرح جذبہ اور تخیل کا امتزاج شعر کو نکھار دیتا ہے۔ اگر صرف تخیل ہے اور جذبہ نہیں تو وہ ایک ایسی عمارت کی مانند ہے جو ہوا میں معلق ہو اس کے برعکس بغیر تخیل کے جذبہ ایک ایسا عمل ہے جس کو روح کی بالیدگی سے کوئی تعلق نہیں۔ فانی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غم کی گرانباری کے باوجود کہیں بھی تخیل اور جذبہ کے امتزاج کو فراموش نہیں کیا جس کی وجہ سے اس کا جمالیاتی حسن برقرار رہا۔

درد کو پھر ہے میرے دل کی تلاش — خانہ برباد کو گھر یاد آیا
ہر تبسم پہ یہ کھاتا ہوں فریب — کہ انھیں دیدۂ تر یاد آیا
چن لیا تیری محبت نے مجھے — اور دنیا ہاتھ مل کر رہ گئی
مطلب یہ ہے کہ آج ہوئی نذر دل قبول — ارشاد ہے کہ آئینہ ہم رو برو کریں
بچھ گئے راہِ یار میں کانٹے — کس کو عذر برہنہ پائی ہے

فانی کے کلام میں نزاکت خیال اور ندرت ادا کی مثالوں کی بھی کمی نہیں۔ دل اور دل کی خلش اگرچہ پامال مضمون ہے مگر دیکھئے اس کو فانی کس طرح ادا کرتے ہیں۔

تجھے خبر ہے ترے تیرِ بے پناہ کی خیر — بہت دنوں سے دل ناتواں نہیں ملتا
دو نام ہیں ہستی و فنا ایک ہی دل کے — مارا ہے اسی دل نے جلایا ہے اسی نے
مژدہ انجام غم کے پہلو میں — دل بہ عنوانِ درد رہتا ہے

ندرت خیال اور ندرتِ ادا کی چند مثالیں اور ملاحظہ ہوں:۔

وہ بدگماں کے مجھے تاب رنج زیست نہیں — مجھے یہ غم کہ غم جاوداں نہیں ملتا
سن کے تیرا نام آنکھیں کھول دیتا تھا کوئی — آج تیرا نام لے کر کوئی غافل ہو گیا

وہاں سجدے سے اب تک قدسیوں کے سر نہیں اٹھے پڑا تھا جس جگہ راہ محبت میں قدم میرا

وہ شام وصل دشمن زلف سلجھاتے ہیں رک رک کر
انھیں یاد آگئیں کیا گتھیاں میرے مقدر کی

فصل گل آئی یا اجل آئی کیوں در زنداں کھلتا ہے
کیا کوئی وحشی اور آپہونچا یا کوئی قیدی چھوٹ گیا

ان کا عشق تجریدی یا خیالی نہیں ہے وہ اس کے پیچ و خم سے گذرے ہیں اور اس کے نشیب و فراز سے واقف ہیں۔ اشعار ذیل سے ہمارے دعوے کی تائید ہو سکتی ہے۔

ذکر جب چھڑ گیا قیامت کا بات پہونچی تری جوانی تک

اب انھیں اپنی اداؤں سے حجاب آتا ہے
چشم بد دور دلہن بن کے شباب آتا ہے

کتنے فتنے جمع کیے ہیں ان کی اک جوانی نے
چال قیامت، کافر نظریں، آنکھ شرابی کیا کہیئے

کیوں سادگی میں طور کچھ اب بانکپن کے ہیں
کل تک تو سادگی کی ادا بانکپن میں تھی

اک برق سر طور ہے لہرائی ہوئی سی دیکھوں ترے ہونٹوں پہ ہنسی آئی ہوئی سی

یہاں ہم تھوڑی دیر رک کر اس ظاہری تضاد پر ایک نظر ڈالنا چاہتے ہیں جس کا فانی کو کبھی کبھی ملزم ٹھہرایا جاتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ سنجیدگی اور صداقت پرستی کی روشنی میں یہ امر محال ہے کہ ایک شخص حقیقی عشق سے وابستگی رکھتے ہوئے عشق مجاز کے ترانے گائے۔ یا محبوب مجازی سے لو لگانے کے ساتھ محبوب حقیقی کی محبت کا ساز

چھیڑ دے۔ لیکن ایسا کہنا قرین قیاس نہیں ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مجاز کو حقیقت کا پرتو سمجھتا ہو یا حسن مجازی کے مشاہدے سے اس کو حسن کے اصلی سرچشمے کی تلاش ہو۔ البتہ جس طرح ہر چیز کے حدود و قیود ہیں یہاں بھی پابندیاں موجود ہیں چند مثالیں اور سنیئے۔

تنکوں سے کھیلتے ہی رہے آشیاں میں ہم
آیا بھی اور گیا بھی زمانہ بہار کا

آئی ہے اے نسیم تو اس وقت تک ٹھہر
جب تک بجھے چراغ ہمارے مزار کا

میں نزع میں ہوں، عہد وفا کا محل نہیں
وعدہ نہ کر کہ وقت نہیں اعتبار کا

راز عشق میں اخفا کی شرط ہے۔

دل کے سوا یہاں کو محرم درد دل نہیں
بے خبروں سے کیوں کہیں، اہل خبر سے کیا کہیں

درد عشق زندگی بھر کا روگ ہے۔

وہ جی گیا جو عشق میں جی سے گذر گیا
عیسیٰ کو ہو نوید کہ بیمار مر گیا

آزاد کچھ ہوئے ہیں اسیران زندگی
یعنی جمال یار کا صدقہ اتر گیا

فانی کی زندگی غم دوراں اور غم جاناں کی نذر ہوئی۔ اور دونوں میں ان کو مایوسیوں اور ناکامیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ یہی سبب ہے کہ ان کے یہاں یہ واردات کبھی کرب و اضطراب کے صورت میں نمودار ہوئی اور کبھی طنزیہ پیرایہ اختیار کیا۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ طنز کا اظہار اعلیٰ ذہانت طبع اور قدرت کلام کا امتحان ہوتا ہے۔ دیکھئے فانی کس طرح اس سے عہدہ برآ ہوتے ہیں۔

کہتے ہیں کیا ہی مزے کا ہے فسانہ فانی
آپ کی جان سے دور آپ کے مر جانے کا

کچھ امید کرم میں گذری عمر
کچھ امید کرم میں گزرے گی

خود مسیحا خود ہی قاتل ہیں تو وہ بھی کیا کریں
زخم دل پیدا کریں یا زخم دل اچھا کریں

سید محمد ٹونکی صاحب جن کے نام اس کتاب کا انتساب کیا تھا وہ بھی ہم سے رخصت ہو گئے۔ میری تربیت ذہنی میں ان کے جو احسانات ہیں ان کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

میں سراپا سپاس ہوں اپنے برادر مکرم پروفیسر اختر اقبال کمالی کا کہ انھوں نے فانی کے سلسلہ میں مفید مشوروں سے سرفراز فرمایا۔

ظہیر احمد صدیقی

۱۵ مئی ۱۹۸۱ء

کہتے ہیں حسن ہی کی امانت ہے دردِ عشق
اب کیا کسی کے عشق کا دعوا کرے کوئی

مجھی پر ہیں جفائیں چشمِ بد دور خدا رکھے وہ مجھ پر مہرباں ہے

تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کے خیال میں ندرت، انداز میں انوکھا پن جذبات میں خلوص اور بیان میں سنجیدگی ہے۔ ان کے کلام میں رکاکت اور ابتذال کا نام نہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ وہ ان گنے چنے افراد میں سے ہیں جنھوں نے اردو شاعری کو پستی سے نکالا۔ غزل کو آبرو بخشی اور اس میں وہ لطافت سمو دی جو صرف فارسی غزل کے حصے میں آئی ہے تو شاید مبالغہ نہ ہو۔

فانی کا تصوف

غزل کا مزاج دراصل عاشقانہ ہے۔ اس کے خمیر میں سب سے زیادہ جس چیز کا عنصر غالب ہے وہ حسن و عشق کے نغمے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ غزل کی آفاقیت اور لچک نے دوسرے تصورات کو اپنا تو لیا مگر ان کو اپنا خاص موضوع نہیں بنایا۔ تصوف کی بنیاد بھی چونکہ جمالیاتی تصور پر قائم تھی۔ اس لیے غزل اور تصوف ایک دوسرے سے جلد مانوس ہو گئے۔ تصوف کی راہ سے جو بھی موضوع غزل میں داخل ہوئے وہ اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔ رفتہ رفتہ تصوف نے غزل کے مزاج میں اس حد تک دخل پالیا کہ وہ غزل پھیکی معلوم ہونے لگتی جس میں تصوف کی چاشنی نہ ہوتی۔ کیا مومن کی ان کے عہد میں عدم مقبولیت کا ایک سبب یہ نہیں ہے کہ ان کا کلام تصوف کے عناصر سے خالی تھا۔ یہ ضرور ہے کہ تصوف غزل کا ایک اہم جزو تھا مگر یہ وہ سنگلاخ وادی تھی کہ ہر شخص کی ہمت اس وادی میں قدم رکھنے کی نہ ہوتی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ صوفیانہ شاعری تو رسمی طور پر نبھ جاتی تھی۔ لیکن صحیح معنی میں صوفی شاعر ہونا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہ تھی۔ اگر لوگ صوفیانہ اشعار کہتے بھی تھے تو اس لیے کہ غزل کا رجحان غالب وہی تھا اور یہ محرک اس قدر قوی تھا کہ ہمارے شعرا عقیدہ کے لحاظ سے خواہ صوفی ہوں یا نہ ہوں مگر صوفیانہ اشعار کہنا فرض خیال کرتے رہے صوفی شعرا یہ وہ افراد تھے جو ورائے شاعری چیزے دگر کے ساتھ

بیان کی سنجیدگی۔ لب و لہجہ کی نرمی۔ زندگی کے پوشیدہ رموز سے آگہی۔ فنائیت اور سپردگی۔ نامرادی و برشتگی۔ استغنا و بے نیازی کے اوصاف سے متصف تھے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے امتزاج سے صوفیانہ خمیر تیار ہوتا ہے۔ اور جب کسی شاعر کے یہاں یہ خصوصیات زمانہ کے نشیب و فراز یا ذہنی صلاحیت کے باعث نمایاں ہوتی ہیں تو ہم اس کو صوفی شاعر کہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ اردو شاعری میں صوفیانہ شاعری کی تو فراوانی ہے مگر صوفی شعرا معدودے چند ہی ہوئے ہیں۔ ہمارے خیال میں فانی اگر صوفی شاعر نہ تھے تو کم از کم وہ اس مقام تک ضرور پہونچ گئے تھے جہاں صوفی شعرا کی سرحد شروع ہوتی ہے اور اس میں شاید دو رائیں نہیں ہوسکتیں کہ ان کی شاعری رسمی صوفیانہ شاعری کی راہوں سے بمراحل دور تھی۔ وہ جو کچھ کہتے تھے وہ بہ نحوائے قلندر ہر چہ گوید دیدہ گوید اپنے ذاتی تجربات کی بنا پر کہتے تھے اور خود محسوس کر کے کہتے تھے اور جو کوئی بھی ان کے کلام کو پڑھے گا وہ یقیناً اس نتیجے پر پہونچے گا کہ یہ نیا انداز فکر اور یہ انوکھا اسلوب بیان ایک روایتی شاعر کے اختیار سے باہر ہے۔

فانی کی شاعری کے اس پہلو پر بحث کرنے سے پہلے ضرورت ہے کہ تصوف کے مبادیات پر کچھ روشنی ڈالی جائے۔ صوفیانہ فکر کا آغاز کیونکر ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ انسان فطری طور پر سب سے پہلے جس سے روشناس ہوتا ہے وہ خود اس کی اپنی شخصیت ہے۔ اسی لیے ڈیکارٹ نے کہا ہے کہ (I THINK - THEREFORE I AM) جس کے بارے میں فلاسفہ کا خیال ہے کہ مغرب میں یہ پہلی قطعی آواز تھی جو ادراک ذات کے سلسلہ میں بلند کی گئی۔ جب ہم کسی امر کے بارے میں سوچتے ہیں تو پہلے سوچنے والی

ہستی یعنی انا (Ego) کا ادراک سامنے آتا ہے۔ حتیٰ کہ مشککین یا غادیہ جو حقائق عالم اور اپنی ہستی میں شک کرنے والے یا منکر کہے جاتے ہیں۔ وہ بھی اس ادراک سے دامن نہیں بچا سکتے کیونکہ یہ قضیہ (کہ مجھے فلاں شئے کے وجود میں شک یا انکار ہے) اس امر پر منحصر ہے کہ کم از کم شک کرنے والی ذات وجود رکھتی ہو۔ یہ ادراک ہر بچے سے لیکر بڑے میں پایا جاتا ہو۔ جیسا کہ اقبال کہتے ہیں۔

کودکے را دیدی اے بالغ نظر — کہ بود از معنی خود بے خبر
سادہ و دوشیزہ افکارش ہنوز — چوں گہر پاکیزہ گفتارش ہنوز
جستجو سرمایۂ پندار او — از چرا۔ چوں ۔ کے کجا گفتار او
فکر خامش در ہوائے روزگار — پر کشا مانند باز نوشکار
در پئے نخچیر ہا بگذاردش — باز سوئے خویشتن می آردش
چشم گیرایش فتد بر خویشتن — دستکے بر سینہ می گوید کہ "من"
یاد او با خود شناسائش کند — حفظ ربط دوش و فرداش کند
گرچہ ہر دم کاید افزاید گلش — "من ہمانستم کہ بودم" دوش

ایں "من" نو زادہ آغاز حیات
نغمۂ بیداری ساز حیات

جتنی عمر بڑھتی جاتی ہے انا کا ادراک قوی ہوتا جاتا ہے پھر جب انسان اپنے گرد و پیش پر نظر ڈالتا ہے تو اس کو محسوس ہوتا ہے کہ اس کے ماحول میں جو اشیا ہیں وہ یا تو اس کی مانند ہیں یا اس سے فروتر، تاہم ان میں بہت سے اوصاف مشترک ہیں۔ یہ مادی دنیا کے شعور کی منزل ہے۔ اب وہ ایک قدم اور بڑھاتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ میرا ذہن چند تصورات کلی یا حقائق مطلقہ (حق۔ جمال) خیر کی جولاں گاہ ہے۔ مگر یہ تصور آئے کہاں سے۔ میری ذات یا کائنات

کی اشیا میں جن کی حیثیت جزئیات کی ہے۔ ان کلیات کا سراغ نہیں ملتا۔ لامحالہ کوئی ذات یا ہستی ایسی ہے جو نہ صرف حق۔ جمال اور خیر مطلق سے متصف ہے بلکہ ان کا سرچشمہ ہے اور اسی کے فیضان سے یہ ادراکات میرے ذہن و ضمیر پر منعکس ہوئے ہیں۔ غرض اس کو یقین ہو جاتا ہے کہ عالم کے تجربات اور تصورات کلی یا حقائق مطلقہ کی طرف رہنمائی تو ضرور کرتے ہیں لیکن خود ان حقائق کے حامل نہیں ہیں۔ ایک قدم اور۔ اور یہی فیصلہ کن قدم ہے — یعنی انسان یہ غور کرنے لگتا ہے کہ مجھ میں اور اس ذات میں کیا علاقہ ہے بظاہر وجود ایک قدر مشترک ہے جو مجھ میں اور اصل ذات میں وجہ اشتراک ہے لیکن دونوں کا وجود یکساں نہیں ہو سکتا اور جیسا کہ اوپر کے تجربے سے واضح ہو چکا ہے، پھر دیکھنا ہے کہ اگر فرق ہے تو کیا یہ فرق کمیت (QUANTITY) کے لحاظ سے ہے یا کیفیت QUALITY کے اعتبار سے اگر کمیت کا فرق مانتے ہیں تو طبیعت خود ابا کرتی ہے عقل و کشف بتاتے ہیں کہ کمیت کا فرق کوئی اہم فرق نہیں۔ اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے دو قیمتی کم خواب کے ٹکڑے ہیں۔ ایک پانچ گز کا اور دوسرا صرف گز بھر کا۔ خالق کائنات اور مخلوق کا فرق اگر یہی ہے تو محض سطحی ہے۔ اس لیے لازم آیا کہ وہ فرق کیفیت کا ہو۔ یعنی اس کا وجود واجب ہو۔ ہمارا ممکن اس کی ہستی حقیقی ہو۔ ہماری غیر حقیقی۔ اس طرح عرفان نفس عرفان رب کا زینہ بن جاتا ہے۔ جب یہ مرحلہ طے ہو گیا تو یہ سوال پیدا ہوا کہ اس کائنات کی تخلیق کی حکمت کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اشیائے کائنات عدم کے آئینے ہیں جن میں ذات واجب نے اپنی صورت دیکھنا چاہی۔ جب ایسا ہے

تو ہمارا انتہائے نظریہ ہونا چاہیے کہ ہم جہاں تک ہو سکے اس ہمہ حق ہمہ جمال، ہمہ خیر ذات کا قرب حاصل کر سکیں۔ یہی عقیدہ ہے جس کو تصوف کہا جاتا ہے اور جس کا وجود دنیا کی تقریباً ہر قوم کی فکری اور مذہبی تحریکات میں ملتا ہے۔ غالباً افلاطون یونانی (۴۲۹-۳۴۷ ق۔م) پہلا شخص ہے جس نے دنیا میں تصوف کی آواز بلند کی۔ اس سے پہلے اس دعوت کے ذکر سے تاریخی دستاویزیں خاموش ہیں۔

افلاطون کے بعد فلاطینوس جو فلاطون الٰہی یا الشیخ الیونانی (۲۰۴-۲۷۰ مسیحی) کہلاتا ہے اور اس کے بعد اس کے شاگرد فرفوریوس نے جس کو تصوف فلاسفہ میں خاص امتیاز حاصل ہے ان عقائد کی توجیہ اور توضیح نئے ڈھنگ سے کی جس کی بنا پر اس نظام تعلیم کو نوافلاطونیت NEO - PLATONISM) کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک وجود کے کئی مدارج ہیں۔ (۱) ذات حقیقی (۲) عالم مثالی اور عالم ارواح (۳) عالم اجسام۔ ذات حقیقی واحد۔ غیر محدود سرچشمۂ حیات اور کائنات کی علت اصلی ہے اور باقی اس کے سائے اور عکس ہیں۔

یہاں ہمیں نوافلاطینت کے بنیادی عقائد۔ یا ہندوؤں یا یہودیوں اور دوسری اقوام کے متوازی افکار سے۔ نیز اسلام میں تصوف کے خیالات سے بحث کرنا مقصود نہیں۔ اور نہ ہم کو تاریخی اعتبار سے (اس) عقیدے کے مختلف مآخذ اور ادوار پر روشنی ڈالنا ہے۔ کیونکہ اس طرح ہم اصل بحث سے بہت دور جا پڑیں گے۔ فی الحال دیکھئے کہ صوفیہ نے تصوف کی تعریف میں کیا کہا ہے۔ دراصل ہر شخص نے اس پر کسی خاص پہلو سے نظر ڈالی ہے

یہی وجہ ہے کہ جتنے منھ اتنی باتیں۔ اس پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ شیخ ابوالحسن احمد فرماتے ہیں:۔

"تصوف نفس کی ہر خواہش کو ترک کرنے کا نام ہے۔

ابوعمر دمشقی کہتے ہیں۔

تصوف یہ ہے کہ کائنات کو چشم حقارت سے دیکھے بلکہ اس کی طرف سے آنکھ ہی بند کرلے"

حضرت جنید کہتے ہیں کہ:۔

"تصوف یہ ہے کہ حق تیری انا کو فنا کرکے تجھے اپنے ذریعے سے بقا عطا کرے۔

شیخ ابوسعید کا ارشاد ہے کہ:۔

"تصوف آنست کہ آنچہ در سرداری بہ نہی و آنچہ در کف داری بدہی و آنچہ بہ رو آید نہ جہی"

کوئی اسے تصفیہ الخیال سے تعبیر کرتا اور کوئی تعمیر الظاہر والباطن قرار دیتا ہے تاہم ہر دبستان فکر میں یہ قدر مشترک ہے کہ وجود حقیقی صرف ایک ہے اور اس کے سوا جو کچھ ہے وہ بے حقیقت ہے۔ یہ نقطۂ نظر اصل ہے اور تمام افکار و اعمال کی تفصیلات اس کی فرع ہیں۔ جب تک ایک صوفی سالک ذات حق کو اصل نہ جانے گا اور اس کے سوا ہر کسی کو کالعدم نہ مانے گا تصوف کے تقاضوں پر عمل کرنا اور نفس کی خواہشوں پر قابو پانا ممکن نہیں۔

تصوف پر منحصر نہیں۔ دنیا کا کوئی مذہب ایسا نہیں جو کسی شکل میں اس نقطہ نظر اور اصل الاصول کا قائل نہ ہو۔ نماز، روزہ، حج، جہاد، زکوٰۃ،

صدقہ خیرات۔ دان پن ہر ایک کی بنائے کار یہی ہے۔ ان میں سے ہر عمل ہم سے ایثار و قربانی کا طالب اور کسی نہ کسی حد تک فنائے ذات کا متقاضی ہے۔ ہم اپنا وقت اپنا آرام۔ اپنا خواب و خور۔ اپنی محنت سے کمائی ہوئی دولت اور اپنی جان کسی کی خوشنودی کی خاطر تج دینے پر مامور ہیں۔ خود پروری اور خود نمائی کے لیے نہیں بلکہ کسی دوسری ذات کی ملکیت ہیں جس کی منشا سب سے مقدم اور جس کی مصلحت سب سے اہم ہے۔

آمدم برسر مطلب۔ اس تمہید کے بعد ہم اصل موضوع پر آتے ہیں۔ (محبت حقیقی ہو یا مجازی) بے پناہ طاقت رکھتی ہے اور جب وہ شاعری سے امتزاج پاتی ہے تو چمک کر تلوار ہو جاتی ہے۔ جب شاعر محبت کی اس منزل پر پہنچ جاتا ہے جہاں حسن و عشق کی تمیز باقی نہیں رہتی۔ من و تو کے حجابات حائل نہیں رہتے۔ وہم و گمان کی حدیں ختم ہو جاتی ہیں۔ وہ اپنے وجود کو محبوب کی ذات سے جدا خیال نہیں کرتا۔ ع اس کی ہستی سے جدا میرا وجود اللہ رے وہم۔ تب یہ شاعری وجود میں آتی ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ فانی کی تصوف سے کیونکر وابستگی ہوئی پروفیسر ضیاء احمد صاحب بدایونی کی رائے ہے کہ "فانی کے یہاں تصوف غم دنیا سے پناہ کی راہ سے آیا ہے" ہمیں اس سے انکار نہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی ہمارا عقیدہ ہے کہ ان کا تصوف عام شعرا کی طرح روائتی نہیں ہے۔ ورنہ ان کی شاعری میں وہ خلوص نہ ہوتا جس نے ان کے کلام کو تیر و نشتر بنا دیا اور درجۂ کمال تک پہونچا دیا۔ خود پروفیسر صاحب موصوف فرماتے ہیں کہ ان کا تصوف اصلی تھا۔

"تصوف کا عنصر ان کے یہاں واقعی اور اصلی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ عملی تصوف سے ان کی زندگی نا آشنا رہی تاہم نظری تصوف

ان کے یہاں محض رسماً یا برائے گفتن نہیں ہے"۔

فانی یاسیات کے امام کہے جاتے ہیں۔ اور ان کے افکار کی اساس شوپنہار کی طرح درد و غم ہے۔ مگر شوپنہار خدا کے وجود کو اور اس کی شیت کو (معاذ اللہ) ایک اندھی اسکیم سے تعبیر کرتا ہے اور فانی اس کے خلاف صوفیانہ نظر رکھتے ہیں۔ ہیگل شاعری کو حقیقت مطلق کے اظہار کا ذریعہ بتاتا ہے۔ ممکن ہے کہ کوئی مادہ پرست ایک ایسے وجود کے اعتقاد کو اور اس کی طلب کو لاحاصل قرار دے مگر یہ ایک امر بدیہی ہے کہ اس کے بغیر انسان کے اعلا مقاصد ہمیشہ اس کی نظر سے روپوش رہتے ہیں۔ اور حیات بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ فانی کو تصوف کی شاعری میں ایک خاص درجہ حاصل ہے۔ ان کی حیثیت نہ اس مذہبی زاہد کی سی ہے جو مسند ارشاد پر متمکن ہے اور نہ اس فلسفی کی سی جو خشک مسائل کو اپنا اوڑھنا بچھونا قرار دیتا ہے۔ البتہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ تصوف میں فانی کا بے پایاں خلوص شامل ہے جس میں ان کے فلسفیانہ ذوق طبیعت نے نکھار پیدا کر دیا ہے۔ دل میں محبت کی کسک تھی۔ طبیعت میں فلسفہ کا مذاق تھا۔ ان دونوں کے خمیر سے تصوف کا وجود ہوا۔

عام طور سے کہا جاتا ہے کہ غالب کی فکر اور میر کی یاس نے فانی کا پیکر اختیار کر لیا تھا ہمیں اس صداقت سے انکار نہیں۔ مگر یہ صداقت ادھوری ہے۔ دراصل فانی کی فکر میں غالب سے زیادہ گہرائی اور انکی یاس میں میر سے زیادہ نشتریت ہے۔ وہ صوفی شاعر نہیں بلکہ فلسفی شاعر ہیں۔ تاہم ان کی صوفیانہ شاعری میں میر درد سے زیادہ گہرائی ہے۔ اردو کی صوفیانہ شاعری میں اگر کوئی شاعر ان کے قریب پہونچتا ہے تو وہ صرف اصغر ہیں۔ لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اس وادی میں اصغر بھی ان کے پیچھے رہ جاتے ہیں جیسا کہ آئندہ مثالوں سے واضح ہوگا۔ فکر کی اس نادرہ کاری کا سرچشمہ

کہاں تک پہونچتا ہے اس کے بارے میں ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ اول تو وہ خود قدرت سے ایک سوچنے والا دماغ لے کر آئے تھے جو ہر حقیقت کا راز دریافت کرنے کو بے تاب رہتا تھا۔ اوپر سے فلسفہ کا مطالعہ کیا جس نے سونے پر سہاگے کا کام کیا اسی کے ساتھ ایک پر درد غم اور چوٹ کھایا ہوا دل ان کے پہلو میں تھا۔ یہ چوٹ اگرچہ مجاز کی راہ سے آئی تھی۔ مگر ایک ژرف نگاہ ہستی کی زندگی میں مجاز کو حقیقت کے بام تک پہونچنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ حقیقت کی یہی شعلہ باریاں ہیں جو بجلی بن کر ان کے یہاں کوندتی ہیں اور یہی وصف ہے جس نے ان کے کلام کو ورائے شاعری چیزے دگر ہست کا مصداق بنا دیا ہے سب جانتے ہیں کہ محبت جذبات انسانی میں ایک قوی اور شدید جذبہ ہے اور جب اس کا محور فانی انسان نہیں بلکہ وہ لافانی ذات ہو جو کمال میں لازوال اور جمال میں بے مثال ہے تو اس کی قوت اور شدت کا کیا پوچھنا۔

جرعۂ خاک آلود چوں مجنوں کند صاف اگر باشد ندانم چوں کند

فانی کے کلام میں تصوف کا عنصر اس قدر وافر اور انداز بیان اتنا موثر ہے کہ ان کی صوفیانہ شاعری کو ہرگز ہرگز روایتی نہیں کہہ سکتے۔ ذرا فانی کو صوفی کے روپ میں دیکھئے اور مثال کے طور پر ان کے عقیدہ وحدت کو لیجئے۔ صوفیہ کا ہر دبستان فکر (خواہ وہ ہمہ اوست کا قائل ہو یا ہمہ از اوست کا) ذات حق کی وحدت پر کامل اعتقاد رکھتا ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس کے بغیر تصوف کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ تصوف کی پہلی منزل اپنی خودی کو مٹا دینا بلکہ تمام کائنات کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے۔

اور رہ منزل لیلیٰ کی خطر ہاست بجاں شرط اول قدم آن است کہ مجنوں باشی

فانی کا ماحول اور شخصیت

فانی کا وطن بدایوں (اتر پردیش) تھا۔ کہنے کو تو یہ ایک مختصر سی بات ہے ہر شخص کا تعلق کسی نہ کسی خطۂ زمین سے ہوتا ہے۔ لیکن ہندوستان کے بے شمار معروف اور غیر معروف مقامات کو اپنی تاریخی اور تہذیبی روایات کی بدولت ایک امتیاز حاصل رہا ہے۔ ان مقامات پر پیدا ہونے والے یا وہاں رہنے اور بسنے والے ان روایات کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتے۔ ان کی شخصیت، کردار مزاج، سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز۔ غرض ان کی زندگی کا ہر پہلو ماضی کی روایات اور گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ جس طرح ہم کسی پودے کو دیکھ کر یہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ اس نے کس زمین اور کیسی آب و ہوا میں نشو و نما پائی ہے۔ اسی طرح کسی انسان کے بارے میں اندازہ لگانا مشکل نہیں ہوتا کہ اس کی پرورش کیسے ماحول میں ہوئی ہے۔ یہ بات خاص طور پر ایسے لوگوں پر صادق آتی ہے جنھوں نے علم و ادب یا فن میں کوئی نمایاں مقام حاصل کیا ہو۔ ادبی تحریریں خصوصاً شاعری انسان کی اندرونی شخصیت کا آئینہ ہوتی ہیں اور ان میں صرف لکھنے والے کی حقیقی شخصیت ہی نمایاں نہیں ہوتی اس ماحول کا عکس بھی جھلکتا ہے جس میں اس نے نشو و نما پائی ہے۔

فانی کی شخصیت اور اس کے عوامل کے سلسلہ میں مجنوں گورکھپوری نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس سے فانی شناسی کے کچھ نئے گوشے سامنے

ذیل کی مثالوں سے ہمارا مطلب واضح ہوگا۔

تصوف میں تنزیہہ ذات (جو وجود کا مرتبہ اولیٰ ہے) کو بڑی اہمیت حاصل ہے یہ وہ مقام ہے جہاں اسماء صفات، نسب و اضافات بھی ساتھ دینے سے قاصر ہیں۔ سنیے فانی کس طرح اس مضمون کو ادا کرتے ہیں۔

ہر نام میں اک شانِ تعین ہے بہر حال — جو کچھ بھی ہے ترا نام۔ ترا نام نہیں ہے

ھو الآن کما کان (وہ اب بھی ایسا ہی ہے جیسا کہ تھا) کی یہ تفسیر اور اسکی یہ شاعرانہ تعبیر فانی ہی کا حصہ ہے۔ ہماری نظر نورِ ذات کا حجاب بن گئی ہے۔ مگر کیسا حجاب جو حجاب نور بھی ہے اور ذریعۂ ظہور بھی۔

میری نظر کی آڑ میں ان کا ظہور تھا — اللہ ان کے نور کا پردہ بھی نور تھا

اسی بات کو دوسری جگہ یوں کہتے ہیں:۔

اپنی ہی نگاہوں کا یہ نظارہ کہاں تک — اس مرحلۂ سعئ تماشا سے گزر جا

انھیں انھی کی نگاہوں سے میں نے دیکھ لیا — مری نگاہ کا پردہ اٹھا کے آئے تھے

الاشیاء تعرف باضدادھا کی شرح سنیے:۔

بقا کہتے ہیں جس کو وہ مرا احسان ہے فانی — وہ حادث ہوں کہ دنیائے قدم بھرتی ہے دم میرا

حق تعالیٰ کی معرفت دشوار ضرور ہے مگر ماسوا کی معرفت دشوار تر ہے سبب یہ ہے کہ حق کے وجود کے دلائل تو قدم قدم پر ملتے ہیں مگر ماسوا کا وجود ہی محلِ نظر ہے۔

راز دل سے نہیں واقف دلِ ناداں میرا — تیرے عرفاں سے بھی دشوار ہے عرفاں میرا

اس سے بڑھ کر نادر پیرایۂ بیان دیکھیے۔

یہ جستجو، ہے کہ ہے عالمِ مجاز کہاں — تلاش چشمِ حقیقت نگر نہیں ہے مجھے

دنیا ہمارے ذوقِ نظر کا نتیجہ ہے ورنہ کیسا عالم اور کہاں کا عالم۔

بے ذوقی نظر بزم تماشا نہ رہے گی — منھ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

غالب کے اس شعر کے بعد:۔

ہے غیب غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

دوسرے کے لیے پہلو بچا کر یوں کہنا جیسا کہ فانی نے کہا مشکل تھا۔

ہر جلوہ غیب شہود ہے پھر بھی غیب کے جلوے غیب میں ہیں

نظارہ نظر میں شامل ہے نظارے میں شامل کوئی نہیں

مگر انصاف یہ ہے کہ غالب کا شعر ندرت کے اعتبار سے لاجواب ہے جب ایسا ہے تو دعوئ وجود کی جو حقیقت ہے معلوم ہے۔

مرا وجود کفر۔ مری زندگی گناہ — ہستی کو ہوش، ہوش کو لازم خودی ہوئی

فانی کو تنزیہ پر اس قدر اصرار ہے کہ عکس تو عکس، تجلی کو بھی دوئی کا نشان خیال کرتے ہیں جس کو ذات کی بارگاہ میں بار پانا محال ہے۔

خود تجلی کو نہیں اذن حضوری فانی — آئینے ان کے مقابل نہیں ہونے پاتے

خدا اور ماسوا کی نسبت پر صوفیہ اور شعرا نے جو کچھ لکھا ہے اس کو پیش نظر رکھیے اور فانی کے یہ اشعار پڑھیے۔

کس کو کہیے ماسوا جب تو نہیں تو کچھ نہیں — تو نظر آیا تو اک عالم نظر آیا مجھے

صور منصور وطور ارے تو یہ — ایک ہے تیری بات کا انداز

ان کو یہ بھی گوارا نہیں ہے کہ مجاز و حقیقت کی اصطلاحیں استعمال کر کے دوئی کا اقرار کیا جائے جو ان کے نزدیک وحدت کے انکار کے مترادف ہے۔

ہے کوئی شے تو یار و جلوہ یار — یہ حقیقت ہے اور یہ اصل مجاز

ہستی ہی نہیں جو باطل ہو پھر فرق مجاز و حقیقت کیا — یہ عرض حقیقت ہر ذرہ حقیقت ہستی باطل کوئی نہیں

آپ ہی اپنی آڑ میں تو ہے　　تو حقیقت ہے اور تو ہی مجاز

حق اور خلق میں کیا رشتہ ہے۔؟ تصوف نے اس سوال کا جواب دیا۔ ہے کہ خلق یا عالم یا کائنات کی خدا سے الگ کوئی ہستی نہیں ان کا استدلال یہ ہے کہ جب سے خدا ہے اس کا علم بھی ہے، عقل قبول نہیں کرتی کہ وہ ذات ہو اور علم اس سے جدا ہو۔ علم اس کی اساسی ایجابی صفات میں سے ہے جو عین ذات ہے۔ پھر علم کے لیئے معلومات کا ہونا ضروری ہے یہ کیونکر ممکن ہے کہ علم ہو اور معلومات نہ ہوں۔ یہی معلومات الٰہی یا تصورات یا خیالات ہیں جو اعیان ثانیہ کہلاتے ہیں[1] اور جو کائنات کی اصل ہیں۔ یعنی کائنات انھیں خیالات کا عکس یا پرتو ہے۔ یہ اعیان اس لحاظ سے تو ثابت اور یقینی ہیں کہ ذات حق کے ساتھ پائے جاتے ہیں دوسرے الفاظ میں یہ نفس باری تعالیٰ میں قائم ہیں مگر اس لحاظ سے وجود سے معرا ہیں کہ ذات حق سے الگ اپنی خارجی ہستی نہیں رکھتے۔ ان کا وجود بھی اضافی اور عدم بھی اضافی۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا، یہی خیالات ہیں جو اس تمام کارخانے کی بنیاد

---

[1] اعیان ثانیہ ESSENCES EXISTING IN THE MIND OF GOD

یہاں ایک صوفیانہ نکتہ بیان کرنا شائد فائدہ اور دلچسپی سے خالی نہ ہو قرآن مجید میں کہا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی شے کو حکم دیتا ہے کہ کن (ہو جا) تو وہ ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حکم کس کو دیا جاتا ہے۔ اگر شے موجود کو دیا جاتا ہے تو معاذ اللہ تحصیل حاصل اور فعل عبث ٹھہرتا ہے اور اگر غیر موجود کو دیا جاتا ہے تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک چیز موجود بھی نہ ہو اور مامور بھی ہو۔ صوفیا اس کا جواب دیتے ہیں کہ اس حکم کا اطلاق اعیان ثانیہ پر ہے یعنی حق سبحانہ ان معلومات و تصورات کو ایک اعتباری وجود قبول کرنے کا امر فرماتا ہے جس کو وہ بہ امتثال امر قبول کر لیتے ہیں اور عالم وجود میں آجاتا ہے۔ یہی ان کے نزدیک تخلیق کا راز ہے۔

ہیں۔ دیکھئے فانی اس مضمون کو کس طرح ادا کرتے ہیں۔

ابتدائے زندگی انتہائے زندگی　　آپ کے خیال سے آپ کے خیال میں

اس ایجاز و بلاغت کے ساتھ اس کی تشریح مشکل سے دوسری جگہ ملے گی[1]۔ کچھ مثالیں اوپر نظر سے گذریں۔ کچھ یہاں جا بجا بکھری ہوئی پیش خدمت ہیں۔

ترے خیال کے اسرار بے خودی میں کھلے　　ہمیں چھپا نہ سکے ورنہ دل کو کیا معلوم
ملتی نہیں تصور ہستی سے اب نجات　　گھر سا گیا ہوں حلقۂ دام خیال میں
آدمی میں کچھ نہیں، آپ نے سمو دیا　　عالم غبار کو عالم خیال میں
ایک عالم کو دیکھتا ہوں میں　　یہ ترا دھیان ہے مجسم کیا

اس مقام کا عرفان ہونے کے بعد دنیا سراسر وہم نظر آتی ہے۔

واہمے کی یہ مشق پیہم کیا　　یاس و امید شادی و غم کیا
گرم و سرد زمانہ جو کچھ ہو　　ورنہ فردوس کیا جہنم کیا
مستی و ہوش کے فسانے ہیں　　جشن پرویز و عشرت جم کیا
غم تو واعظ غم بہشت بھی ہے　　امتیاز غم جہنم کیا
یہ حجابات بھی اٹھے آخر　　دل پہ درد و چشم پرنم کیا

چند اور مثالیں سنیئے:۔

یہ نقش قدم ہیں رہ بے منزل دل میں　　فردا تو ہے فردا پس فردا سے گذر جا
کر قطع نظر وسوسۂ قلب و نظر سے　　ہر جلوہ پوشیدہ و پیدا سے گذر جا
کعبہ ہو کہ ہو دیر وہ دنیا ہو کہ عقبیٰ　　ہر منزل و ہر جادہ و ہر جا سے گذر جا

---

[1] اس مضمون کو ایک دوسرے پیرایہ میں ایک اور کہنہ مشق استاد ثاقب بدایونی نے اس طرح ادا کیا ہے

عدم میں آئینہ ٹھہرے وجود میں تصویر　　تمھاری شان ہمیں سے کھلی کہیں بھی رہا

تجلیات دہم ہیں مشاہدات آب و گل کرشمۂ حیات ہے خیال وہ بھی خواب کا

مگر یہ کیفیت ہمیشہ نہیں رہتی اور اگر ہمیشہ رہے تو نظام عالم قائم نہ رہے۔

گہے برطارم اعلیٰ نشینم گہے بر پشت پائے خود نہ بینم

یہی وجہ ہے کہ سالک جو اس کا لذت آشنا ہے۔ اس لذت کے دوام اور تکرار کیفیت کے قیام کا خواہاں رہتا ہے۔ فانی کی شاعری میں موت و مرگ کی تکرار پڑھ کر اکثر حضرات کی پیشانی پر شکن آجاتی ہے اور وہ اپنے ظرف کی نمائش کرتے ہوئے ان کو 'سوز خواں' اور 'بیوہ عالم' کے الفاظ سے یاد کرنے لگتے ہیں۔ مگر مادی اور جنسی چٹخاروں کی غلاظت میں لوٹنے والے فانی کی رسائی خیال کا اندازہ نہیں کر سکتے یہ ضروری ہے کہ ان کی شاعری میں اوّل اوّل لکھنؤ کے ماحول کے اثر سے موت کفن اور قبر کا ذکر ضرور ملتا ہے لیکن بعد کو ان کے یہاں فنا کا وہ مفہوم آتا ہے جب سالک اپنی ہستی۔ ہستی کے علائق۔ شادی و غم بلکہ تمام امتیازات و اعتبارات و تعینات کو تج دیتا ہے اور اس کے سامنے صرف ذات رہ جاتی ہے۔ بلکہ اس کے سامنے، کا نقرہ بھی خیال کے تامت پر تنگ اور مذاق تصوف کے لیے موجب ننگ ہو جاتا ہے۔ ذیل کے اشعار ہماری تائید کے لیے کافی ہوں گے۔

درد دے کر دل فانی کو مٹا دینا تھا	اس حقیقت کو بھی افسانہ بنایا ہوتا
فانی فسون موت کی تاثیر دیکھنا	ٹھہرا وہ دل کہ جس پہ سکوں کا گماں نہ تھا
لذتِ فنا ہرگز گفتنی نہیں یعنی	دل ٹھہر گیا فانی موت کی دعا کر کے
کشتی کا سہارا ہی تو گرداب ہے فانی	دریا ہی میں تو ڈوب کے دریا سے گذر جا
وہ حرف صد یقیں سہی حیات پر حیات ہے	کہاں سے لاؤں اعتبار مرگ کامیاب کا

میرے سوا تھے اور جو پردے سارے کے سارے چاک ہوئے
یہ بھی اگر اللہ نے چاہا کوئی دم میں چاک ہوا

رسمی اور روایتی شاعری سے یہاں بحث نہیں۔ واقعی اور اصلی شاعری میں بھی ایسا دیکھا گیا ہے کہ شاعر ایسے ایک یا چند الفاظ بہ تکرار لاتا ہے جو اس کی روح کے بنیادی سُر (KEY NOTE) یا اس کے نظام فکر کے حقیقی محور کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ مومن کی غزلوں کے مقطعوں میں کفر و ایمان اور فانی کے یہاں فنا کو یہی درجہ حاصل ہے۔ لیکن یہ خیال صحیح نہیں کہ انکی فکر کی رو یہیں پر ختم ہو جاتی ہے۔ بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھتے اور فنا کو بقا کا زینہ سمجھتے ہیں

میں ہوں فانی صحیفۂ باقی — حرف بے معنیٔ فنا کی قسم
اب نئے سُر سے چھیڑ پردۂ ساز — میں ہی تھا ایک دکھ بھری آواز
دیکھئے کیا ہو عشق کا انجام — دل کی ہستی ہے موت کا آغاز
حسن ہے جاوداں بے آغاز — عشق آغاز۔ جاوداں انجام
بہت تنگ ہے وہم و ہستی کی دنیا — میں عالم ہی اب دوسرا چاہتا ہوں

دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ اب تک سیر الی اللہ کی منزل میں تھے اب سیر فی اللہ کی راہ پر گامزن ہیں۔ پہلی منزل کی گیرائی اور دل آویزی مسلم مگر دوسری منزل کی نیرنگیاں اور حیرت سامانیاں اپنا جواب نہیں رکھتیں اس عالم بے مثال کی مثال (اگر ہو سکتی ہے) یوں سمجھئے کہ ہم ایک مقام سے بلا تشبیہ دلی کی جانب روانہ اور راہ کے عجائب سے دوچار ہوئے۔ لیکن جب دلی پہونچ گئے تو معلوم ہوا کہ کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست ہر ہر قدم حیرت کدا اور ہر ذرہ بوالعجبی کا مظہر نظر آتا ہے۔

غرض کہاں تک تشریح کی جائے اور کہاں تک مثالیں دی جائیں۔ ان کا دیوان درحقیقت ایک بحر محیط ہے جس میں ایسے ہزاروں گوہر نایاب ملتے ہیں۔ لیکن اس بحث کے ختم کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ فانی اول و آخر ایک شاعر ہیں۔ شاعری ہی ان کی طاقت بھی ہے اور کمزوری بھی۔ ان کو فلسفی یا صوفی کہنا دراصل حقیقت کی غلط تعبیر ہوگی وہ فلسفی تو اس لیے نہیں کہ انھوں نے کسی مربوط فلسفیانہ نظام فکر کی دعوت نہیں دی ہے۔ یہاں پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم پروفیسر اسلوب احمد انصاری کے ایک مقالے سے چند سطور نقل کر دیں۔

> گوئٹے نے ایک بہت ہی معنی خیر بات کہی ہے اور اسے آئرستانی شاعر ڈبلو۔ بی ایٹس (YEATS) نے جگہ جگہ دہرایا ہے یعنی یہ کہ شاعر کو چاہیئے کہ وہ فلسفہ سے بخوبی واقفیت حاصل کرے۔ لیکن اسے اپنی شاعری سے باہر رکھے۔ فلسفہ چاہے خود اپنا ہو یا مستعار کا ہو۔ شاعری میں بجنسہ جگہ نہیں پاتا۔ دراصل شاعری کے سلسلہ میں اس اصطلاح کا استعمال ہی غلط ہے۔ زندگی میں بصیرت اس کا بہتر مرادف ہو سکتا ہے۔ شیکسپیر یا غالب کے یہاں فلسفیانہ بصیرت ملتی ہے لیکن مجرد فلسفہ نہیں[1]۔

اسی کے ساتھ ہم ان کو صوفی بھی نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ جہاں تک ہمیں علم ہے وہ کسی خانوادہ تصوف سے وابستہ نہیں تھے۔ وہ ایک عظیم شاعر تھے جن کو قدرت نے فلسفیانہ بصیرت کے ساتھ صوفیانہ انداز نظر بھی عطا کیا تھا۔ اب

---

[1] تعلیم و تدریس شعر (ساقی نومبر ۱۹۶۶ء) اسلوب احمد انصاری۔ صفحہ ۲۷۔

ہم ان کے صوفیانہ انداز نظر کے چند دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالنا چاہتے ہیں۔

جبر و اختیار کا مسئلہ آج سے نہیں بلکہ ہزاروں برس سے انسانی عقول کو سرگرداں کیے ہوئے ہے کہ انسان مجبور ہے یا مختار۔ یہ امر جس قدر مذہبی حیثیت سے اہم ہے اسی قدر فلسفیانہ نقطۂ نظر سے بھی قابل غور ہے۔ اگر ہم مجبور محض ہیں تو شریعت یا قانون سے کیا فائدہ۔ اس طرح تمام مصلحان عالم کی سعی بلکہ معاذ اللہ انبیائے کرام کی بعثت ہی لغو ٹھہرتی ہے اور سزا و جزا کی بحث ہی لاطائل قرار پاتی ہے اور اگر ہم مختار ہیں تو پھر یہ ماننا پڑتا ہے کہ حق تعالیٰ کا ہماری زندگی اور افعال پر کوئی گرفت نہیں۔ پھر یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ ہم کسی امر کا مصمم ارادہ کر لیتے ہیں اور تمام اسباب ظاہری فراہم ہو جاتے ہیں اچانک کوئی ایسا غیر متوقع حادثہ رونما ہو جاتا ہے جس سے ہمارے ارادوں کی پوری عمارت زمین پر آ رہتی ہے۔ حکیم اسلام حضرت علی مرتضیٰ نے سچ فرمایا تھا، عرفت ربی بفسخ العزائم (میں نے اپنے رب کو ارادوں کے فسخ ہو جانے سے پہچانا) اسلام پر موقوف نہیں۔ ہر مذہب اور ہر مکتب فکر نے اس مسئلے کو خاص اہمیت کی نظر سے دیکھا ہے۔ اسپنوزا کہتا ہے کہ نہ ہم مجبور محض ہیں اور نہ اخلاقی قدروں سے گریز کر سکتے ہیں اس لیے عمل کی پوری ذمہ داری ہم پر ہے۔ اس کے برخلاف شوپنہار کا عقیدہ ہے کہ انسان مجبور محض ہے۔ اس کا نہ کوئی ارادہ ہے اور نہ اختیار اس لیے اس پر سزا و جزا عاید نہیں ہو سکتی۔ اس آئینہ خانے میں ہماری شکل ایک عکس کی سی ہے۔ جو صاحب عکس کا پابند ہے۔ خود مسلمانوں میں دو بڑے فرقے جبریہ اور قدریہ اسی بنا پر وجود میں آئے۔ قرآن مجید میں جہاں انسان کی مشیت کو خدا کی مشیت کا تابع بتایا گیا ہے وہاں سزا و جزا کی اہمیت پر بھی خاص زور

دیا گیا ہے۔ اسی لیے جمہور اہل اسلام جبر و قدر سے ہٹ کر بین بین کے قائل ہیں۔
اب دیکھئے کہ اس باب میں صوفیہ کا کیا موقف ہے۔ چونکہ ان کے نزدیک ماسوا
کا کوئی حقیقی اور خارجی وجود نہیں ہے اس لیے لامحالہ ماسوا کے ارادہ و اختیار کی
بھی کوئی اصل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا رجحان بیشتر جبر کی طرف ہے۔ اگرچہ انھوں
نے اس رجحان کے زیر اثر عمل کی اہمیت سے کبھی انکار نہیں کیا۔ بظاہر یہ صورت
اجتماع ضدین کی سی معلوم ہوتی ہے لیکن کسی نے سچ کہا ہے کہ ہر بڑے نظام فلسفہ
میں کبھی نہ کبھی اضداد سے سابقہ پڑ جاتا ہے۔ جیسا کہ بتایا گیا ہے کہ ایمان کی منزل
خوف و رجا کے درمیان[1] واقع ہے۔ فانی بھی جبر کی طرف مائل نظر آتے ہیں۔ تدبیر
کو تقدیر کا محکوم مانتے ہیں۔ چند اشعار بطور مثال پیش کیے جاتے ہیں۔

میری تدبیروں کی مشکل اب تو یارب سہل کر　　کیا یہ ساری عمر منھ تکتی رہیں تقدیر کا
فکر راحت چھوڑ بیٹھے ہم تو راحت مل گئی　　ہم نے تسمت سے لیا جو کام تھا تدبیر کا
حسن تدبیر نہ رسوا ہو جائے　　راز تقدیر الٰہی کو نہ پوچھ

اگر راز تقدیر آشکار ہو جائے تو تدبیر انسانی کی تمام دل آویزیاں اور حیات
کی تمام سرگرمیاں رکھی رہ جائیں۔

جب میں نے دعاؤں کا رخ سوئے فلک دیکھا　　تدبیر کے پہلو میں تقدیر نظر آئی

یعنی کھل گیا کہ تدبیر کی تگ و دو تقدیر کے دائرے سے باہر نہیں جا سکتی۔

کام اس تدبیر پر ہے منحصر　　واسطہ جس کو نہ ہو تقدیر سے

ظاہر ہے کہ نہ ایسی تدبیر میسر ہوگی نہ کام بن پڑے گا۔

---

[1] حسرت کا شعر ہے۔ منزل وصل یار ہے پیدا　　درمیان حد دو بیم و رجا

سعیِ درماں بے اثر۔ فکرِ دوا بے فائدہ — زخمِ دل اے چارہ گر قائل نہیں تدبیر کے
یاس کے آتے ہی ارماں دل سے یہ کہہ کر چلے — ہم نہیں ساتھی تری بگڑی ہوئی تقدیر کے

اس غزل کا مقطع سنیے۔ بے پناہ شعر ہے۔

دیکھ فانی وہ تری تدبیر کی میت نہ ہو — اک جنازہ جا رہا ہے دوش پر تقدیر کے

چند شعر اور اس دعوے کی تائید میں سنیے:۔

کر مری توبہ کو مقبولِ شکستِ توبہ — میری تدبیر بنا تقدیر کی افتاد بھی ہے
غم نصیبوں میں ہے فانی غمِ دنیا ہو کہ عشق — دل کی تقدیر سے تدبیر بدل جاتی ہے
مجبورِ شکایت ہوں تاثیر کو کیا کہیے — تدبیر مقدر تھی، تقدیر کو کیا کہیے لہ

اسی کے ساتھ جبر و اختیار پر فانی نے جو ندرت آفریں اور دل نشیں خیالات پیش کیے ہیں وہ انھی کا حصہ ہے۔ ان کی نادرہ پرواز طبیعت نے اس خشک مبحث میں کس قدر نازک پہلو پیدا کیے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ہر شعر شعریت سے بھرپور ہے

زندگی جبر ہے اور جبر کے آثار نہیں — ہائے اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں

زید کے سامنے شراب اور شربت لائے جاتے ہیں اور وہ اپنے اختیار سے ان میں سے ایک (مثلاً شراب) کو پسند کر لیتا ہے۔ شاعر یہ کہنا چاہتا ہے کہ یہ نام نہاد اختیار بھی جبر کی ایک صورت ہے۔ یعنی زید کی افتادِ مزاج۔ ماحول کے محرکات نے اس کو مجبور کیا کہ وہ شربت کی جگہ شراب ہی کو قبول کرے۔ یہ بظاہر اختیار اور

لہ ۔ میر کے اشعار ملاحظہ ہوں

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی — جو چاہتے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا
یاں کے سپید و سیہ میں ہم کو دخل جو ہے سو اتنا ہے — رات کو رو رو صبح کیا یا دن کو جوں توں شام کیا
منھ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ — کہنے کو اختیار سا ہے کچھ

آجاتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں۔

"نانی جیسے شاعر کے کلام کو جانچنے اور اس پر رائے دیتے وقت ضروری ہے کہ ہم چند باتوں کو ضرور دھیان میں رکھیں کوئی شاعر یا فن کار اپنی تمام انفرادیت اور نرالی شخصیت کے باوجود اپنی نجی زندگی کے خارجی اسباب و حالات اور اپنے عہد کے اجتماعی اور معاشرتی میلانات و محرکات سے بے تعلق یا ان سے بالاتر نہیں تصور کیا جا سکتا ہے۔ ہم تسلیم کریں یا نہ کریں شاعر یا فن کار اپنے زمانے کی تخلیق ہوتا ہے اور اس کی تمام خصوصیات و علامات کچھ اجاگر کچھ پوشیدہ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے وجدان و فکر کو وہ مختلف اسباب و علائق متعین کرتے ہیں جن کو ہم مجموعی طور پر ماحول کہتے ہیں اس کا احساس شعور اپنے گرد و پیش کے خفیف سے خفیف ارتعاش سے تیز اور مستقل اثر قبول کرتا ہے اور اگر وہ خود اپنے اندر بسیط عصری قوت رکھتا ہے تو وہ اپنے ماحول پر خود بھی اثر انداز ہوتا ہے اور گرد و پیش کی فضا میں نئے ارتعاش بھی پیدا کرتا ہے۔ بہر کیف شاعر اپنے ماحول کا غلام تو نہیں ہوتا لیکن اس سے الگ اور بے نیاز بھی نہیں ہوتا۔"[1]

نانی بدایونی کے شاعرانہ مقام اور منصب کو سمجھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان کے وطن کو علمی، ادبی اور تہذیبی اعتبار سے گزشتہ صدیوں

---

[1] غزل سرا مجنوں گورکھپوری

بباطن جبر کی کارفرمائی تھی مگر دیکھنے میں کوئی جبر نظر نہیں آتا اسی لیے کہا ہے کہ اس قید کو زنجیر بھی درکار نہیں۔

محشر میں جبر دوست سے طالب ہوں داد کا آیا ہوں اختیار کی تہمت لیے ہوئے

فانی داد اس لیے چاہتے ہیں کہ جبر دوست کا پردہ رکھنے کے لیے انھوں نے اختیار کی تہمت اپنے سر لے لی۔

فانی ترے عمل ہمہ تن جبر ہی سہی سانچے میں اختیار کے ڈھالے ہوئے تو ہیں

جبر اس لیے کہ تمام امور علم الٰہی میں پہلے ہی طے ہو چکے ہیں۔ لیکن اختیار کا سانچا یعنی کسب انسانی بھی ساتھ ساتھ ہے۔ اور اسی بنا پر انسان کو مکلف ٹھہرایا گیا ہے۔ اسی مضمون کو فانی نے دوسری جگہ بیان کیا ہے۔

وہ ہے مختار سزا دے کہ جزا دے فانی دو گھڑی ہوش میں آنے کے گنہگار ہیں ہم

حقیقت تو یہ ہے کہ یہی ہوش یعنی کسب انسانی ہی اختیار کی علامت ہے۔

دوسری جگہ لکھتے ہیں۔

امید عفو ہے ترے انصاف سے مجھے شاید ہے خود گناہ کہ تو پردہ پوش تھا

کیا ہے خلق مجھے باوجود علم گناہ یہ ابتدا ہے کرم کی تو انتہا کیا ہے

مراد یہ ہے کہ قدرت کی طرف سے گناہ کی تخلیق ہی اس امر کا ثبوت ہے کہ اس نے انسان کے کسب پر پردہ ڈالا ہے۔

فانی کی اخلاقی شاعری

اردو نے فارسی غزل کی جو روایت ورثے میں پائی اس میں متصوفانہ افکار اور واردات تصوف سے شدید وابستگی کسی دور از کار توجیہہ کی محتاج نہیں۔ ہندوستان میں اردو غزل نے جس دور میں نشوونما پائی اس کے نفسیاتی اور سماجی عوامل بڑی حد تک ایران اور وسط ایشیا کے ان حالات سے مماثلت رکھتے تھے جنھوں نے انتشار و ابتلا کے دور میں فارسی غزل کو اس کا مخصوص لہجہ اور رنگ و آہنگ عطا کیا تھا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ہندوستان کا مسلم معاشرہ بھی ایسے ہی حالات سے گزر رہا ہے جن سے ایران اور وسط ایشیا منگولوں کے حملوں کے دور میں گزر چکا تھا۔ ہمہ گیر تباہی و بربادی۔ اقدار کی پامالی اور صدیوں میں تعمیر پانے والے اداروں کی اور روایتوں کی شکست و ریخت۔ جہات اجتماعی کی بے نظمی اور عدم تحفظ کا احساس۔ سیاسی طاقت کا زوال اور معاشی ابتری و بدحالی ہر دور میں غزل میں باطن گزینی سریت اور ماورائیت کے رجحان کے لیے سازگار رہی ہے اور اسی کی بدولت ایسے شعرا بھی جنھیں عقیدتاً یا عملاً تصوف (بہ مفہوم اصطلاحی) سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ مصطلحات تصوف اور متصوفانہ افکار ہی کے

دامن میں پناہ ڈھونڈھنے پر مجبور رہتے ہیں۔ اردو غزل کا تو آغاز ہی ایسے دور میں ہوا تھا۔ جب مغل سلطنت کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ ایک جانب زوال پر عجمی تمدن کے مظاہر اور دوسری جانب اندرون ملک ابھرنے والی افتراق پسند قوتیں اور پھر سب سے بڑھ کر جدید مکنالوجی اور مادی وسائل سے مسلح ایک بدیشی سامراج کی یلغار نے ہندوستانی ذہن کو غزل کے ان اثرات کو قبول کرنے کے لیے تیار کر دیا تھا جو فارسی غزل کے مزاج میں پہلے ہی راسخ ہو چکے تھے۔ غزل کی یہ روایت گرد و پیش کے حالات۔ مادی زندگی کے حقائق و واقعات کے بلاواسطہ براہ راست اظہار کی متحمل نہ ہو سکتی تھی۔ لیکن اس سرمایۂ غزل میں بکثرت اس بات کی شہادتیں ملتی ہیں کہ شاعر کی حساس طبیعت روایت غزل کا سہارا لے کر رمز و ایما اور غزل کی مخصوص علامات کی وساطت سے اپنے تاثرات و احساسات کے اظہار کی پناہ ڈھونڈھ لیتی ہے۔

ولی کے دور ہی سے اردو شاعری میں غزل کی جو روایت "سکۂ رائج الوقت" کی طرح مقبول ہوئی وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے خالصتاً عجمی روایت تھی۔ یہاں دوسری اصناف سخن (مثلاً قصیدہ۔ مثنوی۔ مرثیہ وغیرہ) میں نمایاں عجمی رنگ و آہنگ کا تذکرہ بے محل ہوگا لیکن اس عجمی مزاج۔ انداز فکر و احساس اور عجمی اسالیب نے جس طرح اردو غزل کو ابتدا ہی سے متاثر کیا اس کے چند پہلوؤں کی جانب اشارہ ہمارے موجودہ موضوع کی وضاحت کے لیے شاید مفید و معاون ثابت ہو۔ کیونکہ فانی کا رنگ تغزل دان کے منفرد انداز فکر اور مخصوص لب و لہجہ

کے باوجود) ایسی روایت کا پروردہ تھا۔ زمانہ حال کے اکثر ناقدین نے جن میں ترقی پسند ناقدین کی بڑی تعداد بھی شامل ہے، غزل میں جدید حسیت[1] کے فقدان پر بڑا زور دیا ہے اور اس اعتبار سے اس کو خارجی حقائق سے اغماض۔ درون بینی۔ زندگی اور جہد عمل سے گریز۔ موت غم پسندی اور انفعالیت کے رجحانات کا آئینہ دار قرار دیا ہے۔ فانی کی شاعری پر معاندانہ یا غیر ہمدردانہ تنقیدوں میں بھی یہی نقطہ نظر نمایاں نظر آتا ہے۔ ان اعتراضات اور ان کے ممکنہ جوابات کی بحث تو اپنے مقام پر آئے گی۔ یہاں میں فانی کے کلام میں متصوفانہ رجحان کے بارے میں چند اشارات کرنا چاہتا ہوں۔

فانی کی شاعری میں تصوف کے رجحان (یا مضامین تصوف کی فراوانی) کو ایک حد تک روایتی عوامل کا نتیجہ قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاید کسی حد تک ان کی شاعری میں ایسے متصوفانہ عناصر بھی مل جائیں جو انیسویں صدی کے نصف آخر کی شاعری میں دبستان داغ کی عاشقانہ معاملہ بندی اور شوخی اور متاخرین شعرائے لکھنؤ کی تصنع آمیز ہوس ناکی و تعیش کوشی کے غلبہ کے باوجود ایک زیریں لئے

---

[1] حسیت (بمعنی SENSIBILITY) کے لفظ سے مجھے اختلاف ہے لیکن میں نے یہاں اس کا استعمال اس جدید تنقید کے رائج الوقت اصطلاح کے طور پر کیا ہے۔ میرے نزدیک لفظ حسیت انگریزی کے لفظ SENSUOUSNESS کا ترجمہ ہو سکتا ہے لیکن جس مفہوم میں جدید ناقدین اسے استعمال کرتے آئے ہیں۔ اس کے لیے مجھے طرز احساس زیادہ موزوں معلوم ہوتا ہے۔

(UNDERTONE) کے طور پر غزل میں ابھرتے رہتے تھے۔ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ سرسید و حالی کی اصلاحی تحریکوں کے زیر اثر غزل کے لب و لہجہ میں تبدیلی پیدا ہوئی (میری مراد حسرت۔ فانی۔ شاد عظیم آبادی۔ اصغر۔ جگر وغیرہم کی تطہیر غزل کی کوششوں سے ہے) اور مروجہ غزل کی اخلاقی پستی۔ ابتذال، خارجیت پسندی۔ بے لگام ہوس کوشی اور خلوص جذبات سے تہی دامنی کی تلافی اس متصوفانہ رجحان کی بدولت ہوئی جس نے ایک جانب عشقیہ شاعری کی اصلاح کر کے عارفانہ رنگ پیدا کیا اور عشقیہ جذبات میں وہ لطافت اور طہارت پیدا کر دی جس نے انیسویں صدی کی غزل بڑی حد تک بیگانہ ہو چکی تھی۔ اس تحریک اصلاح و تطہیر کے ائمہ میں فانی کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

فانی کے کلام میں متصوفانہ افکار و واردات سے جو شدید وابستگی نظر آتی ہے اس میں حصہ ان کے وطن (بدایوں) کی دینی روایات کا بھی ہے۔ ان کی نجی زندگی کے واقعات، حوادث نے بھی ان کے میلان طبع کو تقویت پہنچائی۔ ان عوامل کے علاوہ فلسفۂ مشرق و مغرب کے مطالعہ نے ان کے احساسات و افکار کو ربط اور آہنگ عطا کیا اسی بنا پر مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ فانی نے اپنے عہد کی اردو غزل میں کار فرما متصوفانہ عناصر سے اس طرح استفادہ کیا کہ اس پر شیخ علی حزیں سے منسوب طنزیہ فقرہ "برائے شعر گفتن خوب است" صادق نہیں آتا۔ وہ عملاً صوفی نہیں تھے لیکن تصوف کی واردات و کیفیات سے بیگانہ بھی نہیں معلوم ہوتے تھے۔ ان کے کلام میں اگر ایک جانب تصوف کے دقیق نکات و لطائف کی بڑی دل نشیں تعبیر و تفسیر بھی ملتی ہے۔ جس کی مثال غالب کے بعد کسی دوسرے غزل گو شاعر کے یہاں نہیں ملتی تو دوسری طرف وہ عملی تصوف کے منازل و مراحل سے بھی اس حد تک

آشنا معلوم ہوتے ہیں کہ ان کے کلام میں ان مراحل کا ذکر بھی محض برائے گفتن نہیں معلوم ہوتا۔

فانی کے یہاں تصوف (جسے ہم سہولت کی خاطر عجمی تصوف کے مقابلے میں اسلامی تصوف سے تعبیر کر سکتے ہیں روحانی اور اخلاقی نظم و ضبط (DISCIPLINE) کا ایک جامع نظام ہے جس کا سرچشمہ نو فلاطونی فلسفہ یا ویدانت میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ماخذ قرآن مجید اور احادیث نبوی کی تعلیمات ہیں یا قرون اولیٰ کے اکابر صوفیہ کے اقوال و اعمال ہیں۔ اس تصوف کی راہ خلوت اور کوہ و دشت کی جانب نہیں جاتی بلکہ انسانی زندگی کے ہنگامہ زار میں رہتے ہوئے روح کے خلوت کدے کی جانب سالک کی رہنمائی کرتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا کہ فانی کی زندگی میں ایسی واردات تصوف کا کوئی سراغ نہیں ملتا لیکن ان کے کلام کے جو اجزا ان منازل کی نشان دہی کرتے ہیں ان سے صداقت بیان اور خلوص جذبات کی بھی شہادت ملتی ہے اور اس بنا پر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ فانی سالک راہ نہ سہی لیکن ان منازل کے سالکوں سے روحانی وابستگی ضرور رکھتے ہیں۔

گذشتہ سطور میں اشارہ کیا گیا کہ فانی نے تصوف کی راہ اباحت بے قیدی اور بے راہ روی کا جواز تلاش کرنے کے لیے نہیں اختیار کی۔ وہ اسے انسانیت کی تکمیل کا ایک ذریعہ خیال کرتے ہیں اور یہ کمال انسانیت یا مطلوب حقیقی کا قرب انسانی تعلقات و روابط کی اصلاح ہی سے میسّر آتا ہے۔

تصوف کا یہی رشتہ ہے جو مذہب کے اخلاقی نظام سے ملتا ہے۔ وہ شاعر جنھوں نے باضابطہ طور پر اخلاق کو ایک مسلک اور مقصد کے طور پر اپنایا بلکہ اپنی شاعری اور تنقید میں اس کی اہمیت اور افادیت پر زور دیا ان میں حالی کا نام

سب سے پہلے آتا ہے۔ حالی کے نظام اخلاق میں رحم۔ مروت۔ ہمدردی انصاف اور اخوت کو ایک خاص مقام حاصل ہے۔ مگر حالی کا اخلاقی نظام ان کی مقصدی یا تبلیغی نظموں میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ غزل میں جہاں انھوں نے اپنے اس مسلک کا اظہار کیا ہے وہاں وہ ایک شاعر سے زیادہ مبلغ نظر آنے لگتے ہیں اردو غزل میں اخلاقی اصول و تعلیمات کا اظہار سب سے زیادہ تصوف میں ملیگا اس کا سبب یہ ہے کہ صوفی صوفیانہ تعلیم کے اثر سے اپنی اعتباری حیثیت کو فنا کر دیتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس زندگی کی مکروہات سے اپنے دامن کو پاک کر لیتا ہے اور ایک نیا انسان جنم لیتا ہے جو باطن کی صفائی اور روحانی ترقی حاصل کر لیتا ہے تصوف کے موضوعات پر اگر غور کریں تو پتہ چلتا ہے کہ یہ وہ عناصر ہیں جو انسانی عظمت کے ضامن ہیں۔ مثلاً ملک و مال و جاہ سے گریز توکل، قناعت۔ صبر۔ فقر۔ ہمت اور رضائے الٰہی کی پابندی۔ یہ سب وہ صفات ہیں جو انسان کو افضل المخلوقات کا مرتبہ بخشتے ہیں۔ ان اقوال میں۔ جب شاعر کا تجربہ بھی شامل ہو جاتا ہے تو پھر وہ پوری ذمہ داری اور اعتماد سے بات کہہ سکتا ہے۔ اگر اس کے تجربات میں سچائی ہے تو ان کا دل پر اثر ہونا۔ ناگزیر ہے۔

اب فانی کی شاعری پر نظر ڈالیے تو پتہ چلے گا کہ وہ اس اعتبار سے صوفی نہیں تھے کہ کسی حلقہ ارادت سے وابستہ ہوں مگر نظری طور پر انھوں نے اپنے ذہن میں نظام فکر قائم کر لیا تھا کہ ان کے حال اور قال میں فرق باقی نہیں رہا۔ فانی کے یہاں جو اخلاقی اصول ملتے ہیں وہ محض تدریس اور تلقین نہیں ہیں۔ بلکہ زندگی کے تجربات نے ان کو عرفان بخشا ہے۔ فانی کے اخلاقی درس کے دو

منبع ہیں۔ ایک عشق اور دوسرا غم جو لازمۂ عشق ہے۔ ایک کے باعث تجربات حاصل ہوئے اور دوسرے کی وجہ سے اس میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہوئی۔ ممکن ہے کہ فانی کو معلم اخلاق کی حیثیت سے پیش کرنے پر بہت سے چہروں پر طنز آمیز مسکراہٹ پیدا ہو جائے اور خالص ادبی اور جمالی قدروں کے پرستاروں کو ادب کی قلمرو میں معلم اخلاق کی مداخلت ناگوار گذرے مگر حقیقت یہ ہے کہ اخلاقی تصورات کے باعث شعر میں جو طہارت، پاکیزگی اور نکھار پیدا ہوا ہے اس نے کسی طرح بھی شعریت کو مجروح نہیں ہونے دیا ہے۔

دنیا کی بے ثباتی ہمارے شعرا کا محبوب موضوع رہا ہے مگر اس بے ثباتی کے تصور نے رہبانیت اور زندگی سے فرار کا رجحان پیدا کیا اور دنیا سے دل نہ لگانے کی تعلیم دی۔ دنیا اور غم دنیا کے بارے میں فانی کا مسلک آزادی و بے نیازی کا مسلک ہے جس کے سامنے ع دنیا گذر گئی غم دنیا لیے ہوئے
لیکن نہ اس بے نیازی میں فرق آسکا نہ زندگی کی مثبت قدروں کا ایمان متزلزل ہوا۔

یوں سب کو بھلا دے کہ تجھے کوئی نہ بھولے	دنیا ہی میں رہنا ہے تو دنیا سے گذر جا
ناکام ہے تو کیا ہے کچھ کام پھر بھی کر جا	مردانہ وار جی اور مردانہ وار مر جا
دنیا کے رنج و راحت کچھ ہوں تری بلا سے	دنیا کی ہر ادا سے منہ پھیر کے گذر جا
اس بحر بے کراں میں کشتی کی جستجو کیا	ساحل کی آرزو کیا، ڈوب اور پار کر جا

کسی ناقد نے کہا ہے کہ صوفی یا عارف کبھی قنوطی نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ جو فانی کے یہاں غم کی فراوانی دیکھتے ہیں ان کو غلط فہمی ہوتی ہے کہ وہ قنوطی ہیں۔ قنوطی شاعر زندگی کے بارے میں یہ رویہ اختیار نہیں کر سکتا۔

موجوں کی سیاست سے مایوس نہ ہو فانی گرداب کی ہر تہہ میں ساحل نظر آتا ہے

مرے جوش طلب کی شان استغنا کوئی دیکھے
کہ میں رہبر سے آگے، مجھ سے آگے ہے قدم میرا

مزاج دہر میں ان کا اشارہ پائے جا جو ہو سکے تو بہر حال مسکرائے جا

سوال یہ نہیں ہے کہ وہ دنیا کو بے ثبات خیال کرتے ہیں بلکہ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کے اس قدر مصائب اور مسائل کے بعد بھی وہ کیا چیز ہے جو ان کے اعتماد کو برقرار رکھتی ہے۔ وہ دراصل ان کی مذہبی اور روحانی قدریں اور خدا پر بھروسہ ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو فانی کو قنوطیت کے قریب سے واپس لے آتی ہے۔ فانی کا پورا کلام پڑھ جائیے اس میں ایسے کم مقامات ملیں گے جہاں وہ خدا سے مایوس ہوئے ہوں۔ مثلاً ان کا اپنی لوح مزار کے لیے وہ قطعہ، خدا ندا شت[ے]، لکھ تو لیا مگر اس کے بارے میں قاضی عبدالغفار کی یہ روایت قابل غور ہے کہ شدت یاس کے باوجود "طغیان ناز" کے اشارے نے ان کو انکار محض سے بچا لیا۔

جھک گیا تیرے آستاں پہ جو سر پھر کسی آستاں پہ خم نہ ہوا
فانی غم ناخدا نہ کرنا کشتی کو مری خدا بہت ہے

بغیر کسی تفصیل کے عنوانات کے تحت فانی کے اشعار پیش کر رہا ہوں۔ ان اشعار کے پیچھے کون سی اخلاقی اقدار پوشیدہ ہیں ان کو تلاش کرنا آپ کا کام ہے۔

مظلوم کی آہ سے عرش الٰہی ہلنے لگتا ہے

ناعاقبت اندیش! قیامت کو سمجھ مظلوم سے ڈر خدا کی عادت کو سمجھ

یہ عرش کو سو بار ہلا آئی ہے
آواز شکست دل کی طاقت کو سمجھ

غرور کا سر نیچا ہوتا ہے

اللہ رے مال و جاہ و ثروت کا غرور
اس خاک کے پتلے کو قیامت کا غرور
اس آج کے فرعون نے یہ بھی دیکھا
فرعون رہا اور نہ حکومت کا غرور

خود داری

اک کلمۂ شوق لب پہ لایا نہ گیا
افسانۂ آرزو سنایا نہ گیا
فانی ارنی نہ اپنے منھ سے نکلا
احسان تجلی بھی اٹھایا نہ گیا

دیکھا نہ اہل دل نے کسی دن اٹھا کے آنکھ
دنیا گذر گئی غم دنیا لیے ہوئے
اس بحر بیکراں میں ساحل کی جستجو کیا
کشتی کی آرزو کیا ڈوب اور پار کر جا
ظالم کا نہ شکوہ کر ظلموں کی نہ پروا کر
تو اپنی وفاؤں کی عزت پہ فدا ہو جا

زندگی عمل اور جد و جہد سے تعبیر ہے

راحت کا مفہوم یہی ہے جہد طلب سے باز نہ آ
بڑھنے دے دل کی بے چینی، تڑپے جا آرام نہ لے

لہ نوٹ ۱۰۲ کا بقیہ
لہ آوازِ جہاں گذشت کہ آخر خدا نہ بود
او ایں چنیں بزیست کہ گوئی خدا نداشت
طغیان ناز بیں کہ بہ لوح مزار او
ثبت است سال رحلت فانی "خدا نداشت"